ایک دعا کی موت
فاروق انصار

ایک دُعا کی موت

فاروق انصار

"...... اور ایک دن
وِداع کی گھاٹیوں میں
گم ہو جاتی ہیں دُعائیں
اور ہم
بانجھ ہو جاتے ہیں/ بانجھ اور ناکارہ
یہی ہماری شناخت ہوتی ہے
اور اسی شناخت کا بوجھ لیے
مر جاتے ہیں ہم"

ایک دعا کی موت

افسانے

فاروق انصار

زیر اہتمام

ساشا پبلی کیشن

T-101 تاج انکلیو، لنک روڈ، گیتا کالونی، دہلی۔110031

نام کتاب : ایک دُعا کی موت

ناشر : فاروق انصار

پتہ . E/694 16 ٹینک روڈ گنیش گلی نمبر 3
قرول باغ، نئی دہلی ۔5

تعداد : 500

قیمت : 100

سرورق : ساحر داؤد نگری

کمپوزنگ : ایس ۔ اے ۔ قنوجی

زیر اہتمام : ساشا پبلی کیشن
T-101 تاج انکلیو، لنک روڈ، گیتا کالونی، دہلی-110031

مطبع : این ۔ کے پرنٹر ز، رمیش پارک، دہلی ۔۹۲

ملنے کے پتے

(1) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔

(2) اہلوو الیہ بک ڈپو، ۹۹۸۸/۴۹، نیورو ہتک روڈ، نئی دہلی ۔۵

(3) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۔۶

(4) بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)

EK DUA KI MAUT

FARUQUE ANSAR

E 16/694 Tank Road, Ganesh Gali No.3
Karol Bagh, New Delhi-5

انتساب

دادا محمد قاسم انصاری

عرف کارو میاں

اور

دادی زہرہ بی بی

کے

نام

ایک دعا کی موت

فاروق انصار

یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

EK DUA KI MAUT 2003
BY FARUQUE ANSAR Rs. 100/-

ترتیب

کنفیشن

فاروق انصار

وقت، اُڑن کھٹولے پر اڑتا رہا۔ زمانہ بدلتا رہا ___
اور کہانیاں بھی زمانے کا زہر پی پی کر بدلتی رہیں ___

یا ___
کہانیاں، ہم سے بہت آگے نکل گئیں ___
ہم بہت پیچھے رہ گئے ___
ایک الفی خاموشی سے وداع کی پہاڑیوں میں اتر گئی
نئ الفی نے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ زمین کا بوسہ لیا ___

یہ سب کیا لکھ رہا ہوں ___
گزرتا ہوا ہر لمحہ مجھ سے جاننا چاہتا ہے ___ فاروق انصار! ادب کی خاردار وادیوں میں کیوں آگئے؟ یہاں تو کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ سیاست ہی سیاست ہے۔ جو سیاست جانتا ہے۔ وہی اصلی جوکر ہے اور وہی فاتح ہے ___
تم کیا ہو فاروق انصار ___

ایک سیدھے سادے بھلے مانش کا ادب سے کیا سروکار؟

میں، کہنا چاہتا ہوں۔ میرے اندر لفظ، چیختے ہیں۔ میں اپنے تجربات کو لفظوں کی زبان دینا چاہتا ہوں۔

خاموش مکالموں کو صدا دینا چاہتا ہوں۔

بچپن سے امید اور نا امیدی کے جو بھی پھول چنے ___ آشا، نراشا کے جو بھی کانٹے میری تقدیر بنے ___ آرزو، امنگوں اور کامیابی کے جو بھی دیپ میرے حصے میں آئے ___ میں وہ سارا کا سارا ___ اِن بھولی بسری کہانیوں کی زباں میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

بے زبان بچپن ___ امرود کے پیڑوں پر بیٹھے ہوئے کوّے ___ غلیل اور پتھر کا ساتھ ___ زندگی اور آگ کا ساتھ ___ پھول اور کانٹے کا ساتھ ___ محبت اور نفرت کا ساتھ ___

بچپن کے دن بیتے رہے بھیاّ......

بچپن کے دن بیتے رہے بھیاّ......

تو بچپن کے دن بیت گئے۔ دُکھ کی فصلیں کبھی خوشیوں کی پھوہاریں۔ کبھی امید کے چراغ کبھی نا امیدی کے آنسو ___

'بچپن گزر گیا اور جوانی کے انمول رقص کی شہنائیاں گونج اٹھیں...... پھر اس انمول رقص کے حصے میں کیسی کیسی داستانیں سما گئیں ___

گل و بلبل کے افسانے ___

داستان ہزار رنگ ___

حسین ___ رنگ برنگی تتلیوں کے قصے ___

آج افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ آپ کے سامنے رکھتے ہوئے، عمر کا رتھ وڑتے دوڑتے ایک بار پھر پیچھے مڑتا ہے۔ مجھے دیکھتا ہے۔ ٹھہرتا ہے۔ پھر مجھ سے کہتا ہے۔

'فاروق انصار! محاسبہ کرو ___

کیونکہ یہ صرف کہانیاں نہیں ہیں ___

یہ کہانیاں تمہاری زندگی کا لہو، تمہارے شہ رگ سے ٹپکتا خون ہیں۔ تمہاری زندگی کی وہ حکایتیں ہیں، جنہیں لکھتے ہوئے بارہا قلم رویا ہے۔ بارہا آنکھیں اشکبار ہوئی ہیں اور کبھی ہونٹوں پر کسی کی یاد نے خود بہ خود ایک انوکھی مسکراہٹ پیدا کردی ہے......

تو میں ___ فاروق انصار، کنفیس کرتا ہوں کہ......

یہ کہانیاں ___ یہ کہانیاں جو آپ کے سامنے ہیں۔ بے حد معمولی کہانیاں ہیں۔ لیکن اِن کہانیوں کو حقارت سے نہ دیکھئے کہ ایک لمبے بن واس کی تپسیا کا 'پرینام' ہیں یہ کہانیاں ___

سن کون سا تھا' یاد نہیں، لیکن بچپن سے ہی کہانیاں لکھنے کی عادت پڑ گئی۔ ساتویں جماعت میں تھا۔ شاید!۔ اسکول میں مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا۔ میں حصہ نہیں لے سکا۔ ظاہر ہے میرے حصے میں انعام بھی نہیں آ سکا۔ اور یہ انعام میرے ہم جماعت رضاء الرحمٰن کو مل گیا ___

یہ افسانے کے لئے دل سے اٹھنے والی پہلی ٹیس تھی شاید۔

لکھو۔ فاروق انصار۔ کہانی لکھو۔

___ تمہیں افسانہ نگار بننا ہے۔

مضمون نویسی کے مقابلے میں ضیاء الرحمٰن نے جو کہانی پڑھی، وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ ماں ___

ماں...... 'میرا نام جوکر' میں، فلم کے آخر میں راجکپور اپنا آخری شو پیش کر رہا ہے۔ کیا اُس کے منہ سے آپ نے یہ نام سنا ہے؟

اس کی آنکھوں سے پچکاریوں کی طرح پانی نکل رہا ہے ___ لوگ ہنس رہے ہیں ___ لیکن راجو جانتا ہے کہ دراصل اس کی ماں مرگئی ہے ___ اسٹیج کا تقاضہ ہے کہ اسے ہنسنا ہنسانا ہے۔ اور اس ہنسنے ہنسانے پر، کبھی کبھی فنکار رو بھی دیتا ہے۔

میں کنفیس کرتا ہوں کہ 'ماں'، میری افسانوی، دنیا کے لئے ایک زبردست طاقت ثابت ہوئی ___

بچپن کے کتنے ہی چہرے یاد کے پردے پر جھلملاتے ہیں ___ میرے نانا الٰہی بخش، دادا کارو میاں اور ان کے ہم زلف روجن دادا جو مجھے کئی راتوں پر محیط کہانیاں سنایا

کرتے تھے ___ میری بہن سلمیٰ (سالو) حلمیٰ (حالو) چھوٹے ابا علاء الدین چھوٹی ماں، چچا زاد بھائی عبد القیوم، نعیم ___ میرے پہلے استاد مولوی سید عبد الحنان صاحب، سبھ پاٹھی تفضل حسین ___ کلکتہ سی ایم اور ہائی اسکول کے استاد قیصر شمیم، دوست ہم جماعت نصیر احمد، قمر الحسن، شکیل احمد قریشی، جمیل احمد قریشی اور ان کی بڑھی بہن ہم سب کی باجی مہہ جبیں جو شاعری کرتی تھیں اور کشور تلخص رکھتی تھیں، للوہ بن، بیلورمٹھ، جہاز بازی کی یادیں شرارتیں۔

پھر بنگا باسی مارننگ کالج، سیالدہ کیفے ٹیریا' کلکتہ کافی ہاؤس، پروفیسر حیدر حسن کاظمی دھیمن دا، جوہر داس' شاہ نور، رما شہریار آزاد ___ کالج یونین الیکشن ___ زندہ باد زندہ پھاروک دا (فاروق) زندہ باد ___ اور خوف شکست کا وپیا بنرجی سے۔

یاد ہے خلیج بنگال میں جزیرہ دیگھہ ___ سمندر ٹھاٹیں مارتا موجیں، ساحل ننگے پاؤں کانن (مرحومہ) شفیق، جمال (مرحوم) سیلی بوس اور سعیدہ جسے ہمیشہ شکایت رہی کہ میں اس سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔

ٹکٹ! ٹکٹ!! ٹرام اور شہود عالم آفاقی بیل گھیہ ٹرام ڈپو اور غزلوں کی اصلاح۔

اور اس امم البلاد میں میرے دوست ہمدرد بھائی اصحاب الحسن اور جاں محمد عرف جانو بھائی ___ گڑیا! ننھی سی پیاری سی جاپانی گڑیا (شبانہ) میری شاگردہ، پیاری پیاری باتیں شرارتیں ___ ذکر گڑیا (شبانہ) کا ذکر کر کے تو میں کشمکش میں پڑ گیا کہ اس کے متعلق کیا بھولوں کیا یاد کروں، بس اتنا کہ میں نے اپنی ایک بیٹی کا نام شبانہ رکھ دیا۔

اور یہ کیسے بھول سکتا ہوں مٹیا برج بنگالی بازار ہائی اسکول میں مغربی بنگال افسانوی مقابلہ اور میرے افسانہ اعتراف' کو سننے کے بعد نقیب کا یہ کہنا کہ میں فاروق انصار کو سن کر ایسا محسوس کر رہا ہو کہ جیسے منٹو کو سنا۔ ادب شرارتیں، شاعری، ہنگامے اور افسانے ___ کہانیوں کے گلی کوچے اور کولکتہ ___ کولکتہ تجھے سلام ___ کہ ان کہانیوں کا جنم تیری مہانگری میں ہی ہوا ہے۔

یادوں کی اسی رہگذر پر ایک مہربان چہرہ نظر آتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کا چہرہ۔ یہ شفیق مہربان چہرہ میری کہانیوں کو دیکھتا رہا۔ پیٹھ ٹھونکی۔ چشمہ اُتارا۔ غور سے مجھے دیکھا اور پھر کہا ___

'لکھنا جاری رکھو لڑکے۔ ایکدن ......'

خواجہ احمد عباس نے چشمہ پھر پہن لیا تھا۔

'ایکدن ......'

میں اس ایکدن ......' کی خاموشی کو بھول گیا تھا ____ ، پھر 'ایکدن' ...... کی یہی صدا مجھے افسانے کے بازار میں واپس کھینچ لائی۔

'لکھنا جاری رکھو لڑکے۔ ایکدن ......'

خواجہ صاحب کا یہ جملہ، ابھی بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، کیا سچ مچ وہ دن آئے گا؟

میں نے لکھا ہی کیا ہے؟

میں نے تو دُکھ جھیلا ہے۔

مہاتما بدھ کے مہا بھنشکرمن کے پتھ پر چلا ہوں ......

ایک دُکھی رتھ پر ____

'یکدن ......'

میں کنفیس رتا ہو کہ مجھے اس 'ایکدن' کا انتظار نہیں ہے ____ مگر خواجہ صاحب کے انہیں جملوں نے مجھے اس لائق کیا ہے کہ میں اپنا یہ مجموعہ آپ کے سامنے رکھ سکوں۔

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

فاروق انصار

شکریہ!

اشہر ہاشمی
سلیم انصاری
عبدالسلام عاصم
سہیل انجم
عمران عظیم
ساحر داؤد نگری

مشرف عالم ذوقی
فیروز خان
فرقان خان
معین اختر

کے علاوہ کول کاتا کے دوستوں کا شکریہ
کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ اندر کا فنکار کبھی باہر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے پیارے دوستو ___ نصیر احمد، قمر الحق، جان محمد عرف جانو، احسن مفتاحی، اصحاب الحسن، محمد نظام الدین (مرحوم) ___ شکریہ

اور

'قمر النساء' ___ تمہارا بھی ___ کہ تمہاری یادوں کے بغیر اس افسانے کا ہر لفظ ادھورا تھا۔ میرے افسانوں کو زبان تم نے دی! ___ اور میری زندگی کو ایک نیا موڑ، ایک نئی راہ دی ___ شکریہ!!

کہتا ہوں وہی بات......

مشرف عالم ذوقی

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو اپنے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتے۔نہ وہ خوش فہمیوں کے جنگل میں رہتے ہیں، نہ حوصلہ افزائی' اُنکا کچھ بگاڑ سکتی ہے۔نہ وہ ادبی سیاست کی پہلی منزل 'من تُرا حاجی بگویم' پر یقین رکھتے ہیں۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو صرف اپنا کام جانتے ہیں۔یعنی بقول

"اپنا یہ کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں چاہے دوست کہ دشمن کا گھر ملے"

فاروق انصار کو آپ بہ آسانی ایسے کچھ لوگوں میں شمار کر سکتے ہیں۔انکے لیے دشمن کوئی نہیں۔سب دوست ہیں۔خوش فہمیوں اور گمان سے دور' سب کچھ اچھا دیکھنے کی خواہش ان سے کچھ نہ کچھ لکھواتی رہتی ہے۔کاروباری مصروفیات سے وقت چُرا کر' ایک دعا کی موت جیسی کہانیاں لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔لیکن فاروق نے اس سفر کو بھی آسان بنالیا ہے۔

دراصل ان میں ایک بے چین آتما نواس کرتی ہے۔اور یہ بے چین آتما ہی ہے جو بار بار فاروق کے،اندر کے حسّاس آدمی سے کچھ نہ کچھ لکھواتی رہتی ہے۔

فاروق ایک جینوئن فنکار ہیں' ____ ممکن ہے فاروق کی کہانیاں آپ کو روایتی

انداز کی محسوس ہوں ۔ لیکن ان کہانیوں کی زیریں لہروں میں ایک ایسا درد پوشیدہ ہے جو اچانک ہی آپ کو اُداس کر دیتا ہے۔

فاروق انصار کہانیاں بننے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں ۔ یہ وہ فن ہے جو اچھے اچھے لکھاڑیوں کے نصیب میں نہیں ۔ خاص کر' ہمارے یہاں ابھی بھی جدیدیت کے مارے کچھ ایسے فنکاروں کی کہانیاں نظر آتی ہیں' جنہیں کہانیاں تسلیم کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ کہانی کیسے بُنی یا گڑھی جاتی ہیں۔ مکالمے کیسے 'پرورش' پاتے ہیں۔ کردار کس طرح گڑھے جاتے ہیں۔ دراصل کہانی لکھنا شاعری کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ترین کام ہے۔ لیکن یاروں نے اسی 'مہنگے سودے' کو اتنا ارزاں کر دیا ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے خوف کا احساس ہوتا ہے۔

یہ خوف کا احساس فاروق انصار کی کہانیاں پڑھتے ہوئے نہیں ہوتا۔ فاروق کا Vision بہت صاف ہے۔ وہ کہانیوں کی خوبصورت 'بنت' پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ پلاٹ سے کہانی بننے یا کہنے کا ہنر جانتے ہیں ۔ ایک اچھی شروعات، ایک خوبصورت اختتامیہ ___ برجستہ مکالمے۔ ان مکالموں کے درمیان Under Currents اپنا کام کرتے رہتے ہیں___

فاروق انصار کی زمانے پر گرفت مضبوط ہے۔ وہ اپنے حال کا بھی پاس رکھتے ہیں اور ماضی کا بھی۔ زندگی کو افسانہ بناتے ہوئے وہ بات بات میں ایسی حسین شاعری کر جاتے ہیں کہ بس مزہ آجاتا ہے اور یہی فاروق انصار کی کامیابی ہے۔

در اصل ان کی تحریر میں زبردست Readability ہے ۔ یہ Readability کم لوگوں کے نصیب میں ہے۔ فاروق کا زور بھی اس بات پر ہے کہ پہلے یہ کہانیاں پڑھنے کے لئے قاری اپنے آپ کو تیار تو کرے۔ اور یقیناً پہلے ہی جملہ سے کہانی قاری کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح، کہ قاری ختم کئے بغیر اٹھنا گوارہ نہیں کرتا___

فاروق کی کہانیوں کے عنوانات بھی بے حد خوبصورت ہیں___ 'دعا کی موت' بانجھ دعا، جنگ نہیں چاہئے صاحب، سوکھی لکڑی' گیلی لکڑی، ایک کھونٹے سے بندھے ہوئے___ دراصل یہ تمام کہانیوں زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی قاری کے دل

پر سیدھے اترنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ اِن میں ایک خاص طرح کا Pathos ہے، جو انسانی دردمندی سے پیدا ہوا ہے۔ فاروق ایک حساس اور جذباتی فنکار ہیں۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر افسانہ تحریر نہیں کرتے، مگر کہانیوں کو جذباتی بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ کہانیوں کے جذباتی موڑ پر بھی وہ فن کا ساتھ نہیں چھوڑتے ___ فن اور فکر کا یہ حسین امتزاج آج کل بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

میں یہ کہانیاں، 'ایسے موسم' میں پڑھنے کو سفارش کرتا ہوں، جہاں خزاں کے بادل چھائے ہیں اور یہ فن لکھنے والوں سے بتدریج دور ہوتا نظر آرہا ہے۔ فاروق انصار نے یہ حسین کہانیاں آپ کی نذر کی ہیں۔ اور یقیناً یہ روشن کہانیاں ان کے خوبصورت مستقبل کی ضمانت بن گئی ہیں۔

(مشرف عالم ذوقی)

بانجھ دُعا

''......شالو تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے اس لیے تم اتنی جذباتی ہو رہی ہو'' نندنی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے بچوں کے خوبصورت چہرہ، معصوم شخصیت، بھولی ادائیں دیکھ کر لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ سب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں...... کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہیں مگر کبھی پرائے درد کو محسوس نہیں کرتے ...... کون ہے جو خوبصورت گداز تالینوں پر چلتے وقت قالین بنانے والے ان بدنصیب بچوں کو یاد کرتا ہو گا کہ ان کے پھیپھڑے اون کے مہین ریشوں سے چھلنی ہو جاتے ہوں گے...... کسے احساس ہوتا ہوگا کہ ماچس بنانے، چھانٹنے اور پھر ڈبیوں میں بھرنے کے عمل کے دوران بچے گندھک کی خوراک لیتے ہوں گے...... رنگ برنگی دل آویز خوبصورت چوڑیاں پہنتے وقت کسے محسوس ہوتا ہوگا کہ بچوں کے نرم ہاتھ گرم گرم کانچ سے، جلے بھی ہوں گے...... شالو! یہ سب مت سوچو بلکہ یہ سوچو کہ اب آگے کی زندگی کیسے گزارو گی۔''

سات گائنی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے مشترکہ طور پر شالنی سے متعلق فیصلہ دیا کہ اس کے دونوں فلوپین ٹیوب ناقص ہیں اور ابھی تک کوئی ایسی میڈیکل تکنیک ایجاد نہیں ہوئی ہے کہ اسے تبدیل کیا جا سکے اس لیے شالنی فطری طور پر کبھی حاملہ نہیں ہو سکے گی۔

ڈاکٹروں کے اس فیصلہ نے جہاں شالنی کے مستقبل کی راہ میں ہمالیہ حائل کر دیا تھا وہیں ونود کے طلاق کے فیصلہ نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا...... بڑی مشکل سے شالنی نے اپنے وجود کو سمیٹ کر ہمت سے کہا۔ ''تم دوسری شادی کر لو مگر مجھے طلاق مت

دو!''

ونود نے تلخ لہجے میں کہا کہ وہ تو شادی کرے گا ہی مگر اسے طلاق بھی دے گا کیونکہ وہ جس لڑکی سے شادی کرے گا اس کی ایسی ہی شرط ہے۔

''تو کیا تم نے شادی کے لئے لڑکی بھی پسند کر لی؟'' اس کے وجود کے بکھرنے کا کرب اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ''ونود! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم دونوں کی بیج کو اپنی کوکھ میں پرورش کروں اور ماں کا مرتبہ حاصل کروں!!''

''نہیں! رما اس کے لئے تیار نہیں ہوگی۔'' ونود نے شالنی کے جذبات سے بیگانہ ہو کر کہا۔'' اور رما اس وقت میرے بچے کی ماں بننے والی ہے!''

ونود کے اس انکشاف سے اس کی گویائی سلب ہوگئی اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں، کانوں سے سائیں سائیں کا ایک بے ہنگم شور ٹکرا رہا تھا...... شالنی نے اپنی پتھرائی آنکھوں سے دیکھا ونود الماری تک گیا اور نوٹوں کی کچھ گڈیاں اس کے آنچل میں ڈال دیں۔

شالنی سے اپنے وجود کی لاش اٹھائے نہیں اٹھ رہی تھی۔ نندنی اسے سہارا دے کر مائیکے چھوڑنے جا رہی تھی۔ نندنی ہی تو تھی جو اس کے دکھ درد کو سمجھتی اور محسوس کرتی تھی...... شالنی کے چہرے پر ریگستان کی ویرانی اور گرد و غبار کی دبیز تہیں دیکھ رہی تھی۔ کون اس بنجر زمین کی رکھوالی کرے گا کون اسے سیراب کرے گا...... اس پیاسی ندی کو کوئی سمندر نصیب نہیں ہوگا...... اس غم کو وہ کس طرح جھیلے گی، اس عمر میں اس اکیلے پن کو وہ کس طرح ڈھوئے گی............

''میم صاحب! ذرا اپنا پیر ہٹایئے!!'' نندنی نے پنڈلیوں پر ایک نرم و نازک ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ سات آٹھ سال کا ایک لڑکا اس کے قدموں میں جھکا جوتے چپلوں کو ہٹا ہٹا کر جھاڑ دے رہا تھا۔

نندنی نے اسے غور سے دیکھا، میلی کچیلی نیکر اور قمیض پہنے معصوم سا لڑکا جس کے چہرے اور ہاتھوں پر میل کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھی اور اس کے اندر سے گورا رنگ اس طرح جھانک رہا تھا جیسے چاند کے چہرہ پر کالے اور ہلکے بادل کا غلاف چڑھ گیا ہو۔ نندنی نے لڑکے کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے شالنی کو دیکھا۔ شالنی بھی اسے سنجیدگی اور غور سے گھور رہی تھی۔

وہ لڑکا سیٹوں کے نیچے گھس گھس کر کوڑے کچڑے گندگی کو جھاڑو سے ایک طرف نکالتا اور پھر جوتے چپل ٹھیک سے پھر اس جگہ پر رکھ دیتا۔ جو مسافر کتاب یا اخبار پڑھنے میں یا بات چیت میں مصروفیت کی وجہ سے اسے نظر انداز کرتا وہ اس کے پیر کو آہستہ سے چھو کر ہٹانے کو کہتا اور گندگی کو صاف کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس گندگی میں اسے کھانے لائق کوئی چیز مل جاتی تو اسے وہ پھونک پوچھ کر کھا جاتا۔

لڑکا اپنا محنتانہ مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلائے نندنی کے سامنے کھڑا تھا۔ نندنی نے بھی اوروں کی طرح ایک سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا مگر شالنی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' شالنی نے دریافت کیا۔

لڑکا ہاتھ چھڑانے کے لئے زور آزمائی کرنے لگا۔ اسے خوف ہو رہا تھا کہ کہیں اس کی کمائی تو وہ چھین نہ لے۔

''بھوک لگی ہے، کھانا کھاؤ گے؟'' شالنی نے بڑی محبت سے کہا۔ ''پیسے نہیں چھینوں گی!''

لڑکے نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش ترک کر دی۔ شالنی نے نندنی کو کھانے کا سامان نکالنے کو کہا جو وہ خود اپنے گھر سے لے کر چلی مگر اس ایکسپریس ٹرین سے آٹھ گھنٹہ کا سفر طے ہو جانے پر بھی کھانا جوں کا توں رکھا تھا جبکہ اسے بھوک ستا رہی تھی مگر وہ تو شالنی کے غم میں شریک سفر تھی۔

''جاؤ ہاتھ دھولو!'' شالنی نے اس لڑکے سے کہا۔

لڑکے نے واش بیسن کی طرف بڑھتے ہوئے کئی بار کھانے کی طرف گھور گھور کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ کا میل پانی کے ساتھ ٹپک رہا تھا۔ شالنی تولیہ صابن ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ اسے لے کر اندر باتھ روم میں چلی گئی۔

پندرہ منٹ بعد جب اس لڑکے کے ساتھ باہر نکلی تو سب کی نگاہیں اس لڑکے پر جمی رہ گئیں کیا خوبصورت معصوم چہرہ تازہ دم ہو کر نکلا تھا۔ شالنی کا چہرہ بھی کھلا کھلا لگ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ممتا بھری مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

''بیٹا! کیا نام ہے آپ کا؟ شالنی نے اس لڑکے کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''محمد!'' لڑکے نے مختصر سا جواب دیا۔
''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' شالنی نے دوسرا سوال کیا۔
''کانپور!'' پھر مختصر جواب
''آپ کے گھر میں کون کون ہیں؟ شالنی نوالہ کھلانے کے ساتھ ساتھ سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔
''گھر ہی نہیں ہے! محمد نے معصومیت سے کہا'' اور پاپا ممی!'' شالنی کو محمد سے ہمدردی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔
''ابو' امی اور بھیا کو گھر میں گھس کر پولیس نے گولی ماردی۔ باجی کو رمیش انکل زبردستی اٹھا کر لے گئے اور بھیڑ نے ہم سب کے گھروں کو آگ لگادی''۔ محمد کی معصوم چمکتی آنکھوں میں فرقہ وارانہ فساد کا خوف صاف دیکھائی دے رہا تھا وہ کہتے کہتے سہم سا گیا......
شالنی نے اسے پانی پلایا اور سینے سے لگالیا۔
''شالنی!'' نندنی نے اسے جیسے جگایا۔ سامان باندھو اپنا اسٹیشن آرہا ہے''۔
''اسٹیشن آگیا ہے'' شالنی جیسے چونک گئی اور پھر معنی خیز انداز میں نندنی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اب یہاں سے آگے کا میرا سفر محمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔
.........نندنی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ رہا تھا جبکہ شالنی کی آنکھوں میں امید، اعتماد اور سکون کی لہریں ٹھاٹیں مار رہی تھیں۔
نندنی! میں بانجھ نہیں ہوں!...... محمد کی ماں ہوں! شالنی مجسم ممتا بن گئی۔
نندنی مسکرائی اور محمد کی پیشانی چوم کر ٹرین سے اتر گئی۔

جنگ نہیں چاہئے صاحب!

گنگا کے خط کا سب کو انتظار تھا لیکن جب گنگا کا خط آیا تو اس موٹے سے لفافہ کو کھولنے کی کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی سبھی ایک دوسرے کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھے جا رہے تھے مگر گنگا کی ماں کے آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ [illegible] کا ایک سمندر بھی بہہ رہا تھا۔ آخر وہ اپنے شوہر پر ابل پڑی۔

''اب منہ لٹکائے کیا سوچ رہے ہو جب سوچنے کا تھا تب تم نے سوچا ہی نہیں اور جب میں نے تم کو سمجھایا تو ...... تم پر تو دوستی کا بھوت سوار تھا...... وہ بیوہ ہو گئی تھی تو کیا ہوا۔ وہ ہماری بیٹی ہے بوجھ تو نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں کس چیز کی کمی ہے ایک پھل کے لئے وہ ہمارے خاندان کی ناک نہیں کٹواتی۔ سات پشتوں میں بھی ہمارے یہاں کوئی بہو بیٹی کو لچھن نہیں ہوئی ہے۔'' تم نے گنگا کا سرو ناس کر دیا۔ پھر وہ اپنی ساس کی طرف مخاطب ہوئی۔

'' تمہارے کلیجے پر تو ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی۔ تمہاری ایک ہندو ہو جانے سے مسلمانوں کی تعداد میں جو کمی آ گئی تھی اسے تم نے پورا کرنے کے لئے ہماری گنگا کو ایک مسلمان سے پاکستان میں بیاہنے میں مدد کی۔'' اور اس نے اپنے ساس کو جھونٹا پکڑ کر زمین پر پٹخ کر زدوکوب کرنے لگی۔

گنگا کی ماں کی اس حرکت کی گھر کے تمام افراد نے خاموش رہ کر حوصلہ افزائی کی۔ سوائے گنگا کے پتا کے۔ ضعیفہ زمزمی دیوی (سابقہ زمزم بانو) اپنے بیٹا روشن لال کے فوجی مضبوط ہاتھوں میں اسی طرح ڈر وخوف سے سمٹی جا رہی تھی جیسے کبھی روشن کے پتا کے ہاتھوں میں ڈر وخوف سے سمٹ گئی تھی۔

رمزی دیوی جب نارمل ہوئی تو اپنے بیٹے کے سینے سے لگ کر گنگا کی ماں سے مخاطب ہوئی۔ ''بیٹی! زمزم ہو گنگا دونوں پوتر ہیں دونوں کے معنی ہیں پانی۔ پانی کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ فطری رنگ کے علاوہ اور کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اسے تو جس میں ملا دو اس جیسا ہو جائے۔ میں بھی تمہارے سورگیہ سسر جی کے ساتھ ملی اور اس جیسی ہوگئی عورت کا دھرم اس کا شوہر ہے اور شوہر کا دھرم ہے۔ کہاں سے تمہیں مسلمان نظر آتی ہوں۔ کب تم نے مجھے پچھتاتے دیکھا ہے۔ پھر وہ اپنے بیٹا روشن لال کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ''روشن بھگوان کا نام لے کر خط کھول، میرا دل کہتا ہے گنگا سکھی ہوگی۔ اس موٹے سے لفافہ میں گنگا کے دکھوں کا ورنن نہیں بلکہ سکھوں کا ورنن ہوگا''۔

روشن لال نے لفافہ کو پہلے دیوی درگا کے قدموں میں رکھا پھر ماتھے سے لگا کر اسے کھولا تین خط اس سے برآمد ہوئے۔ دو مختصر مختصر اردو میں اور ایک طویل خط ہندی میں۔ اردو میں لکھے دونوں خطوط کو اپنے ماں کے حوالے کر کے جلدی جاننے کی کوشش کی کہ کیا لکھا ہے۔

زمزمی دیوی نے پہلے اس کے سمدھی امانت حسین کی چھٹی پڑھی جس میں سب کو سلام و دعا کے بعد لکھا کہ وہ اب اُس پیپل کے پیڑ کے سائے میں نہیں مل سکے گا۔ وہ امن فوج میں شریک ہو کر بوسنیا جا رہا ہے۔

دوسرا خط گنگا کے شوہر کا تھا۔ اس نے سب کے چرنوں میں پرنام دادی کو السلام علیکم اور بچوں کو آشیرواد اور گوری کو ایک پہیلی لکھی تھی۔ پوچھنے پر گوری نے اچک کر وہ خط دادی کے ہاتھ سے لے لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد پھر دادی کے ہاتھوں میں دے دیا اور بڑے لگاؤ سے کہا۔

''دادی بتاؤ نا جیجا جی نے کیا مذاق لکھا ہے۔'' ''میں بھلا کیوں بتاؤں، تم خود پڑھو۔ میں نے تم کو اردو پڑھنے کے لیئے کہا تھا نا؟''

''وہ تو ممی نے روک دیا تھا کہ اردو مسلمانوں کی بھاشا ہے۔'' گوری نے ماں کی شکایت کی۔اب اردو پڑھوں گی، جیجا جی کو خط تم سے تھوڑی لکھواؤں گی۔'' دادی بتاؤ نا کیا لکھا ہے۔''

اس میں لکھا ہے۔''ایک مرد اور ایک عورت کہیں جا رہے تھے اراستے میں کوئی ملتا ہے اور ان دونوں کا آپس میں رشتہ دریافت کرتا ہے۔ جواب میں عورت کے ساتھ کا آدمی اس آدمی سے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ اس کی ساس اور میری ساس آپس میں ماں بیٹی ہے۔اب بتاؤ اس آدمی اور عورت کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

پہیلی بوجھنے پر منہ مانگا انعام ورنہ..........!''

پہیلی بوجھنے میں اس قدر مگن ہو گئے کہ گنگا کے خط کا کسی کو خیال ہی نہیں رہا آخر ،مزی دیوی نے روشن سے گنگا کا خط پڑھنے کے لئے کہا۔

گنگا کے خط کا ایک ایک لفظ اس کے قلبی سکون وطمانیت اور خوشی کا مظہر تھا۔اس نے لکھا تھا کہ اس کا گاؤں دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ ہے اس کا گھر دنیا میں سب سے خوبصورت گھر ہے۔اس کے گھر کے لوگ سب سے اچھے لوگ ہیں اس کا شوہر سب سے اچھا ہے اسے بہت پیار کرتا ہے پلکوں پر بٹھائے رکھتا ہے..... ماں! دادی ٹھیک کہتی ہے عورت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے اس کا مذہب اس کا شوہر ہے شوہر کا مذہب ہے۔میرا یہاں پر نکاح ہوا ہے اور میں اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئی ہوں اور دادی والا نام رکھ لیا ہے۔زمزم بانو.......... پتا جی میں بہت خوش ہوں میری چنتا نہ کرنا، یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔آپ فوج کی نوکری چھوڑ دینا''۔

روشن لال خلا میں گھور رہا تھا دور دور تک خموشی تھی بس تھوڑی دیر بعد فوجیوں کی ہالٹ، سنائی دیتی۔ برف پوش پہاڑوں اور خطرناک دروں کے درمیان اکثر رائی ہندوستانی چوکی پر وہ تعینات تھا۔پہلی بار جب وہ یہاں تعینات ہوا تھا اور اس کی ماں نے اردو میں خط لکھا تھا تو وہ بڑی الجھن میں پڑ گیا تھا کیوں کہ اس کے بیرک میں کوئی بھی اردو پڑھنے والا نہ تھا۔ آخر ایک فوجی نے اس کا حل بتایا کہ وہ تو No Mens's Land کے قریب جا کر سیٹی بجائے، قریب کے پاکستانی چوکی عیانت شہید سے کوئی نہ کوئی فوجی ضرور آئے گا پھر اس پیپل کے پیڑ کے نیچے جا کر خط پڑھا لینا۔

اس نے ایسا ہی کیا ایک ہم عمر فوجی آیا اور روشن لال کے بڑے عہدہ کو عزت بخشتے ہوئے اسے سیلوٹ کیا اور پھر وہ دونوں اس پیپل کے پیڑ کے نیچے آئے جس نے ہندستان پاکستان کو بانٹنے والی خط مستقیم کو رد کرتے ہوئے اپنی آدھی جڑ پاکستان میں پھیلائی تھی اور آدھی ہندستان میں۔

اسی پیپل کے پیڑ کے نیچے ہندستانی اور پاکستانی فوجی دن میں کئی بار آپس میں ملتے ہیں، ہنسی مذاق کر کے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں اپنے اپنے جذبات سے شریک ہوتے ہیں۔امانت حسین اور روشن لال کی دوستی اس پیپل کے پیڑ کے نیچے پروان چڑھی۔ ساتھی فوجی حیران تھے کہ کیسے امانت حسین اس ہندوستانی فوج سے اتنی گہری دوستی کئے ہوئے ہے ۔امانت تو ہر وقت ہندستانی فوجیوں پر نشانہ سادھے رہتا تھا کیوں کہ اس کے بھائی عنایت حسین کو ایک ہندستانی فوج نے گولی ماری تھی اور پھر بعد میں اسی عنایت حسین کی یاد میں عنایت شہید چوکی کا نام رکھ دیا گیا...... دوستی اور محبت تو تمام نفرتوں اور عداوتوں کو ختم کر دیتی ہے اور ان دونوں کی دوستی تمام نفرتوں، عداوتوں اور مخالفتوں کو روندتے ہوئے روشن لال نے اپنی جواں سال بیوہ بیٹی گنگا کا ہاتھ امانت حسین کے بیٹے دیانت حسین کے ہاتھ میں دیدیا...... محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔امن امن سے ہے امن کے لئے جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔

روشن لال اپنی ماں کا خط لئے عنایت شہید چوکی کی طرف دیکھا تو نومینس لینڈ کے قریب جا کر اس نے سیٹی بجائی ایک افسر آیا روشن لال نے سیلوٹ کیا اور پھر اس اردو میں لکھے خط کو پڑھنے کی گزارش کی۔

خط سن کر روشن لال خوشی سے جھوم اٹھا اور افسر کو سیلوٹ کیا افسر نے ہاتھ ملا کر اسے نانا بننے پر مبارک باد دی!

ایک کھونٹے سے بندھے ہوئے

یہاں کون ہے جو کھونٹے سے بندھا نہیں ہے؟ وقت کے کھونٹے اور...... سب کو جیسے کسی نا کسی کھونٹے نے جکڑ رکھا ہے۔ آگے مت بڑھو۔ کھونٹے کی زنجیر آپ کا راستہ روک لے گی .... کیوں پریشان کرتے ہو آپ کو.... ...... کھونٹا........... قلب کو سکون کیسے میسر ہوتا ہے۔

ہاتھ اوپر رکھنے میں قلب و روح کو کتنا پاکیزہ سکون ملتا ہے اگر اسے لفظوں میں بیان کیا جائے تو یوں کہاں جا سکتا ہے جتنا سکون ایک متقی دیندار کو رات کی دبیز خاموشی میں چھپ کر معبود حقیقی کی عبادت کرنے میں ملتا ہے یا ایک باذوق باادب بانصیب انسان کو کسی بزرگ کامل کی صحبت میں ملتا ہے یا ایک ادب پسند قاری کو ایک اچھی کتاب کے مطالعہ سے ملتا ہے اور یا کسی عیاش کو ایک جوان خوبصورت عورت کے ساتھ ملتا ہے......
اس کے چہرہ پر ایک سکون ٹھہرا تھا۔ ایسا سکون جو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوتا ہے......
دور دور تک کہیں کوئی ہلچل نہیں بس سکون ہی سکون۔ مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے رہ رہ کر یاد آرہا تھا اندیشے کی گرد سے اٹا ہوا ماں کا چہرہ۔ اس کی روتی آنکھیں۔ دور تک ہوا میں لہراتا الوداعی ہاتھ جو لگ رہا تھا کہ پردیس میں کامیابی کی دعائیں دے رہا ہو۔ اسے یاد آرہا تھا اپنی نویلی دلہن کا تازہ دم شبنم سے دھلا چہرہ........... ابھی تو جی بھر کر اسے دیکھا

بھی نہیں تھا، اس کے خوبصورت گداز جسم کے نشیب و فراز سے واقف بھی نہیں ہوا ابھی تو اسے اپنے دلہن کی جسم میں Erotic زون تلاش کرنا تھا مگر نوکری کی تلاش میں دہلی جیسے بے ہنگم شہر میں کھو سا گیا۔

عورت کے جسم میں Erotic Zone تلاش کرنا ہو یا آج کے دور میں اچھی نوکری تلاش کرنا ہو دونوں برابر ہیں۔ ڈھائی مہینے ں مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ نوکری کے لئے دلال کو دی گئی رقم اس کی بیکاری کے تابوت میں آخری کیل ہے۔ دلال نے صاف کہہ دیا کہ دوسری ایکوائر منٹ تک اسے انتظار کرنا پڑے گا، دی گئی رقم کی واپسی نہیں ہوگی۔ واپسی کے لئے کسی بھی طرح کا ردعمل اس کے حق میں نقصان دہ ہوگا۔

نیر اس دیار غیر میں کسی کا کیا بگاڑ سکتا تھا وہ کرائے کے کمرے کو اوڑھ بیٹھا۔ ناکامی نا امیدی نے اسے خودکشی جیسے حرام فعل کے لئے اقدام کرنے لگا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''بیٹا میں آگئی ــــــ تنخواہ دے دو۔''

نیر اس آواز کو پہچان گیا۔ یہ مہیلا صفائی کرم چاری کی آواز تھی ــــــ اسے اس بڑھیا پر سخت غصہ آیا کہ صفائی کو ہفتہ میں دو روز آ کر برائے نام ہی کرتی ہے مگر ہر مہینہ تنخواہ کے لئے پانچ تاریخ کو ہر حال میں حاضر ہو جاتی ہے۔ نیر نے اپنی ناراضگی کا اظہار کئے بغیر اس کے ہاتھ پر تیس روپیہ جلدی سے رکھ کر چلتا کرنا چاہا مگر وہ بڑھیا دروازے پر بیٹھ گئی۔

''بیٹا تھک گئی ہوں۔ زینوں پر اوپر چڑھا نہیں جاتا، ذرا ستا لوں۔''

نیر کو بڑا ناگوار گزرا اور اپنی ناگواری کو طنز میں پرو کر کہا۔

''اس بڑھاپے میں یہ کام کیوں کرتی ہو۔ تمہارے بیٹے ویٹے ہیں کہ نہیں۔''

''ہیں بیٹے ہیں!'' بڑھیا کی آواز میں غرور کا عنصر شامل تھا۔ ''میرے دو دو کڑیل گبرو جوان بیٹے ہیں۔''

''پھر تو بڑے نالائق ہیں۔ اپنی بوڑھی کو ماں کام پر بھیجتے ہیں۔'' نیر مسلسل ناگواری کا مزاج لئے بھرا تھا۔

''نہیں بیٹے، نہیں۔'' بڑھیا اپنے بیٹوں کی کھل کر طرف داری کر رہی تھی۔ ''وہ بڑے سوشیل ہیں، پڑھے لکھے ہیں، سرکار نے انہیں افسری کی نوکری دے رکھی ہے۔

ایک بیٹا الہ آباد میں افسر ہے دوسرا جے پور میں ہے۔ دونوں ہی مجھے اپنے پاس بلاتے ہیں......''

''تو پھر چلی کیوں نہیں جاتی''۔ نیر بات کاٹ کر کہا۔

''کیسے چلی جاؤں بیٹا؟ وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ یہ محلّہ کس کے سہارے چھوڑ جاؤں۔''

یہ محلّہ تمہاری جاگیر ہے کیا؟'' نیر کا جملہ تلخ تھا۔

''ہاں یہ میری جاگیر ہے''۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔'' یہ محلّہ میرے باپ نے مجھے جہیز میں دیا تھا۔'' نیر نے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اس محلّہ کی کمائی سے اپنے دونوں بیٹوں کو اچھی پرورش کے ساتھ اچھی تعلیم دی۔ یہ محلّہ دودھ دینے والی گائے ہے۔ یہاں بڑے اچھے لوگ ہیں۔ اچھا پیسہ دیتے ہیں۔ محلے میں ریڈی میڈ گارمنٹس کی فیکٹریاں ہیں یہاں سے بڑی رقم ملتی ہے اگر میں ان جگہوں میں کمانے جاتی تھی............ میں محلّہ میں کسی اور کو گھسنے نہیں دیتی۔ یہ میرا ہے۔ میرے باپ نے دیا تھا۔ اب سوچ رہی ہوں کہ اس محلّہ کو کسی اچھے شریف آدمی کے ہاتھ بیچ دوں۔ مگر اس برادری میں کوئی شریف نہیں ہے۔ سب شرابی ہیں۔''

اس کام میں شرافت کی کیا ضرورت ہے۔ نیر نے اس کی باتوں سے اکتا سا رہا تھا۔

''ہے بیٹا، ہے!!'' اس بڑھیا نے کہنا شروع کیا۔'' کمانے کے لئے گھروں کے اندر جانا پڑتا ہے گھروں میں بیٹی بہو ہوتی ہیں اور کبھی کبھی گھروں میں کوئی نہیں ہوتا۔ اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی تنخواہ دینے میں دیر بھی کرتا ہے اس وقت برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور آج کے یہ لونڈے لفاڑے چھیڑ خانی کر دیتے ہیں، کوئی نہ دیکھ کر سامان چار لیتے ہیں۔ تنخواہ میں دیری ہو تو گالیاں دینے لگتے ہیں اور کوڑے کو گھروں میں ڈال دیتے ہیں۔ ہے نا غلط بات............!''

''ہاں!'' نیر نے تائید کی، ایسے حالات کا بھی اس نے سامنا کیا ہے وہ نرمی سے کہا۔ مائی! جاتے وقت کوڑا لیتی جانا۔''

''بیٹا آج نہا دھو کر آئی ہوں کل لے جاؤں گی۔'' اور وہ چلی گئی۔

اندھیرے کمرے کی دبیز خاموشی زندگی کی چیخ چیخ کر آواز دے رہی تھی اور وہ آواز اس کی ماں کی تھی۔'' میری قربانیوں کو ضائع ہونے مت دینا۔ تمہاری زندگی

تمہارے باپ کی امانت ہے۔ اس کے خوابوں کو تمہیں تعبیر دینا ہے۔ ان کے خوابوں کی تعبیر کے لئے میں نے اپنے جسم وروح کی قربانی دی ہے۔ تمہیں یاد نہیں .... تمہیں اتنی جلدی بھولنا نہیں چاہئے۔''

تمہارے والد کا جسم ٹھنڈا ہوتے ہی میری رگوں کا خون بھی سرد ہو گیا تھا پھر بھی میں نے نکاح بعوض نقد مہر کیا۔ اگر مقصد نیک ہو تو مصلحت اور سیاست سے زندگی گزارنے میں کوئی برائی نہیں۔ تمہارے والد کی موت کے بعد میری زندگی کا بس ایک ہی مقصد تھا تمہاری اچھی پرورش اور اچھی تعلیم۔

بیٹا تم نے کمہار کو دیکھا ہوگا۔ اس کے بنائے برتن جب تک کچے ہوتے ہیں اس کی حفاظت ہر طرح سے کرتا ہے مگر بھٹی میں پکانے کے بعد اس سے کسی حد تک بے فکر ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں میں نے تمہیں پکا دیا ہے تم پر وقت اور حالات کی گرد اور کائی تو جم سکتی ہے مگر اپنا رنگ وروپ نہیں بدل سکتے۔''

اچانک روشنی کی جھماکے نے کمرے کو زندگی کی حرارت سے بھر دیا۔ وہ بچے ہوئے روپیوں کو شمار کر کے مستقبل کے لئے پروگرام مرتب کرنے لگا۔

''بیٹا! تم کیا کام کرتے ہو؟'' مہیلا صفائی کرمچاری نے کوڑا اٹھاتے ہوئے نیر سے دریافت کیا۔ فی الحال تو نوکری تلاش کر رہا ہوں۔'' نیز کے لہجے میں کرب تھا۔

''ایک بات بولوں۔'' بڑھیا جھجکتے ہوئے بولی۔ ''برا مت ماننا۔ یہ برا ماننے والی بات بھی نہیں ہے۔''

''کہو تو سہی۔'' نیر نے جلدی سے کہا۔

''تم میرا یہ محلّہ لے لو۔'' بڑھیا سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تو کیا اب میں .... بن جاؤں۔'' نیر کو لگا جیسے اسے کسی نے بلندی سے سخت زمین پر پٹخ دیا۔ '' بکواس بند کرو اور چپ چاپ چلی جاؤ۔''

''تم وہ کیوں بنو؟ ...... تم تو صاحب بنے رہنا۔'' بڑھیا چاپلوسی پر آ گئی۔ تم کچھ لوگوں کو اس کام کے لئے نوکر رکھ لینا۔

''اس کام کے لئے تمہارے بیٹے میرے نوکر بنیں گے۔'' اس نے برہمی کا اظہار کیا۔

''بھگوان نہ کرے؟'' بڑھیا برامان گئی اور توقف سے بولی۔''اس وقت یہ کام مسلمان خوب کررہے ہیں۔میری جٹھانی اس وقت دو مسلمانوں کو اپنے پاس تین تین ہزار روپیہ مہینہ پر نوکر رکھے ہوئے ہے۔تمہیں نوکر میں دوں گی۔''

اکرام منڈل، شیخ نور، مجیب الرحمٰن، سعید قاضی، یہ سب نیر کے اسٹاف تھے۔نیر نے اکرام منڈل سے کہا وہ سر پر ٹوپی نہ رکھے اور اپنی داڑھی کٹوائے۔''

''میں آپ کی نوکری چھوڑ سکتا ہوں صاحب!'' اکرام منڈل مذہبی جنون سے بھر گیا۔''میں حافظ کا بیٹا ہوں، پانچ سپارہ میں خود بھی حفظ کیا ہے۔آپ کیسے مسلمان ہیں۔وہ تو بنگلہ دیش بننے سے ہم لوگوں کی ایسی حالت ہوگئی۔''

''اکرام! وہ بات نہیں ہے!'' نیر سمجھانے کے انداز میں بول رہا تھا۔''تمہاری داڑھی اور ٹوپی اوڑھ کر یہ کام کرنے سے مسلمانوں کی بےعزتی ہوتی ہے۔''

میں جانتا ہوں صاحب مسلمان دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔

اکرام نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''انسان پر جب برا وقت آجائے تو اسے صرف جینے کی کوشش کرنی چاہئے۔''

زندگی ہی امید ہے اور امید ہی زندگی ہے۔ہم بنگلہ دیشیوں کا آپ کے ملک میں۔

''ابھی وقت برا ہے صاحب اس لئے یہ بنگلہ دیشی مسلمان کوڑا کچڑا بن رہے ہیں۔ہمارے بچے یہ کام نہیں کریں گے صاحب! نہیں کریں گے۔''

''بنگلہ دیش تو تم بنگالیوں کا خواب تھا!'' نیر نے اکرام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا، مگر اکرام نے اس جملہ کو طنز کی صورت میں لیا اور کہا۔

''بنگلہ دیش نہیں صاحب۔ویراٹ بنگلہ، سونار بنگلہ!

ویراٹ بنگلہ پر اعتراض کرنا چاہا مگر نیر نے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر سمجھا کیوں کہ اسے ڈر ستا رہا تھا کہ اگر یہ بھاگ گئے تو بڑھیا کو دیا ہوا روپیہ بھی ڈوب جائے گا۔اور پھر وہ کہیں کا نہیں رہ جائے گا۔

نیر کے پاس محلّہ کے تمام گھروں کے اب مکمل کوائف تھے وہ ہر روز دو بجے کے بعد انسپکشن کے لئے نکل جاتا اور اپنے اسٹاف کے کاموں کا جائزہ لیتا۔لوگوں کی صفائی سے متعلق شکایتیں سنتا اور اسے دور کرنے کے لئے اپنے اسٹاف کو تاکید کرتا۔اس نے اپنے

چاروں صفائی عملے کو محلّہ کو چار زون میں بانٹ کر ڈیوٹی پر لگا رکھا تھا۔ محلّہ کے لوگ صفائی سے متعلق بہت خوش تھے مگر اس کا دل بجھا تھا اس کی روح مجروح اور بے چین تھی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اس پیشہ کو کیا نام دے۔ سماج میں اپنی شناخت کس طرح کرائے۔

دراصل وہ ہر روز ہر لمحہ خودکشی کر رہا تھا جس طرح کبھی اس کی ماں نے نیر کی پرورش کی خاطر نقد مہر کی شرط پر نکاح ثانی کے نام پر خودکشی کی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ سوالوں کی جنگل میں بھٹک جاتا...... گھبرا جاتا تو قبرستان کی خاموشی میں پناہ لیتا مگر جب کبھی قبر کے بے چین مردے اس سے مخاطب ہوتے تو اسے ایسا لگتا کہ سکون یہاں بھی نہیں۔

سکون ہے تو بس بامقصد حرکت میں ہے، عمل میں ہے، کام میں ہے کام کی تکمیل میں ہے۔ تکمیل ہی انسانی خواہشوں کی معراج ہے۔ اسی کھونٹے سے بندھ کر ہر انسان دور تک چلا جاتا ہے اور راستے میں شرم، غیرت، خودداری دوسری کی خوشیوں کا جذبہ احترام یہ سب کچھ چھن جاتا ہے جو انسانی زندگی کے لئے قیمتی زیور کی حیثیت رکھتا ہے۔

نیر ان زیوروں سے لدا پھدا جھکا جھکا سا رہتا اور جب وہ اپنے اسٹاف کو Salary پے کر رہا تھا تو بھی وہ جھکا تھا۔

گیلی لکڑی سوکھی لکڑی

کئی روز کی موسلا دھار بارش نے زمین پر ہر سمت ایک شفاف آئینہ بچھا دیا تھا۔اس کے گھر میں بھی جگہ بہ جگہ پھوس کی چھپر سے پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہوگیا۔گھر کی دیواریں بھی کچھ نیچے سے اور کچھ اوپر سے گیلی ہوگئی تھیں حس وجہ سے ایک طرف کی دیوار ڈھ بھی گئی تھی۔سورج کی روشنی اس طرف سے آئی تو گھر میں زندگی کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔

کلیسری نے اپنے بیمار بیٹے کو پُر امید نظروں سے دیکھا اسے اس میں زندگی کے رمق نظر آئی۔اس نے خاموشی کی زبان میں اپنے شوہر جتن مانجھی سے کہا'' جاؤ! ڈاکٹر سے دوا لے آؤ۔''

جتن مانجھی تیزی سے دوسرے کمرہ میں گیا اور اس میں رکھے لکڑیوں کا جائزہ لیا اور اوپر والے کا شکر یہ ادا کیا لکڑیاں گیلی نہ ہوتی تھیں۔......اس نے کلیسری کو آواز دی اور دونوں لکڑیوں کا گٹھر بنانے لگے۔

ذرا جلدی جلدی کرو، سکر سکر (آہستہ آہستہ) مت کرو'' جتن مانجھی نے اپنی بیوی کلیسری سے کہا۔''ابھی ' ہتھیا' نکچھتر چل رہا ہے بارش کبھی بھی شروع ہوسکتی ہے۔''

'' اب بارش نہیں ہوگی۔'' کلیسری نے یقین سے انگلیوں پر جوڑ کر کہا۔'' ہتھیا نکچھتر سولہ دن کا ہوتا ہے۔منگل منگل آٹھ، پھر منگل پندرہ اور آج بدھ ہے سولہ روز

پورے ہو گئے۔

اچھا اچھا زیادہ حساب کتاب مت کرو، جلدی جلدی ہاتھ بٹاؤ۔'' جتن مانجھی نے اپنی بیوی کلیسری سے کہا۔''یونم ہوٹل کو ہی ساری لکڑیاں بیچ آؤں گا۔''

یہ دونوں میاں بیوی دوسرے ہریجنوں کی طرح قریب کے جنگل سے سوکھی لکڑیاں کاٹ کر قریب کے چھوٹے قصبہ میں بیچ کر اپنا گزر بسر کرتے۔ مگر اب جنگل میں سوکھی لکڑیاں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی، اس لئے ہرے بھرے درختوں کو فارسٹ افسر کی مدد سے کاٹ کر جنگل میں ہی سوکھنے کے لئے دس پندرہ دن چھوڑ دیتے اور اس درمیان پہلے کی کاٹی ہوئی لکڑیوں کو لا کر بیچتے۔ مگر اب جنگل بھی دور ہو گیا تھا اس لئے دوسرے تمام ہریجن آدی باسیوں کی طرح صبح کو گیا دھنباد لوکل ٹرین سے دو تین اسٹیشن دور ڈلوا، بسکٹوا، لال باغ تک چلے جاتے اور واپس آسنسول بنارس پسنجر سے لوٹتے ہوئے لکڑیوں کا گھٹر بوگی کی کھڑکیوں کی راڈ سے لٹکا دیتے کچھ بوگی کے جوڑوں کے درمیان رکھ دیتے۔ اس کام میں ٹرین ڈرائیور، گارڈ اسٹیشن ماسٹر، آر پی ایف کے جوان سبھی کمیشن لے کر مدد کرتے۔

جتن مانجھی اور کلیسری دونوں میاں بیوی پہاڑ پورا اسٹیشن اترتے اور اپنی لکڑیاں فتح پور، روپن، چمروپت، سیتلپور قریب کے گاؤں اور قصبہ میں بیچ دیتے۔ کبھی کبھی تو پہاڑ پور اسٹیشن میں ہی مارا ماری ہو جاتی۔ بیس روپیہ کی گٹھری تیس روپیہ میں بک جاتی۔

اس روز جیسے ہی دونوں ٹرین سے اترے آندھی اور بارش نے گھیر لیا۔ وہ جلدی جلدی رکشہ سے کسی طرح لکڑیوں کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے گھر آ گئے...... بارش جو شروع ہوئی تو چھوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جیسے جیسے شام ہو رہی تھی کلیسری متفکر ہوتی جا رہی تھی کیونکہ گھر میں راشن ضرورت بھر نہیں تھا۔ رات صبح اور دوپہر کے لئے کھانا شام کو بنا لیتی تھی۔ کچھ اپنے لڑکے کے لئے چھوڑ جاتی اور کچھ دونوں اپنے لئے لے جاتے۔ شام کو اگر راشن نہیں آیا تو کل ان لوگوں کا جنگل جانا مشکل ہو جائے گا۔

کلیسری نے ایک دیا جلایا اور اپنے بیٹے کلن کے سارے کپڑے اتارنے لگی۔

''ارے! اس کے کپڑے کیوں اتار رہی ہو'' جتن حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثر سے بولا۔

''اسے ننگا کر کے آنگن میں دیا جلواؤں گی۔'' کلیسری نے کہا۔ جولڑ کا ننہال میں

پیدا ہوتا ہے وہ اگر ننگا ہو کر بارشم میں بھیگ کر آنگن میں دیا جلائے تو بارش رک جاتی ہے۔''

بارش تو رکی نہیں مگر کلن کو نمونیا کے باعث سانس کے آمد و رفت میں خلل ضرور پڑ گیا۔

رات کو اس کے گھر میں رونے پیٹنے جیسے حالت ہوگئی۔ بازار سے دوا لانا تو ممکن نہ تھا اس لئے لکڑیاں جلا کر رات بھر سرسوں تیل سے مالش کرتے رہے...... صبح ہوتے ہی جتن نے بڑے کسان رگھو یادوے گھر بھیگتے ہوئے جا کر اپنا دکھڑا رو دیا اور سود پر کچھ روپیہ لے آیا۔

کلن کی دوا کے ساتھ راشن اور دارو بھی لے آیا کیونکہ معمول کے خلاف شام کو دارو نہ پینے سے اس کا بدن زخم کی طرح درد کر رہا تھا اس نے کلن کو دوا کھلائی اور دونوں میاں بیوی دارو پی کر سارے جہاں کے دکھ درد سے بیگانہ ہو کر سو گئے۔ جب ہوش آیا تو دیکھا بارش بدستور ہو رہی ہے۔ کلن کا بدن بخار سے تپ رہا ہے اور ٹھنڈ سے کانپ بھی رہا ہے دونوں کو کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرے جتن نے کلن کے حلق میں دارو کے چند گھونٹ اتار دے کہ گرمی آجائے مگر ایسا ہوا نہیں اس کی حالت اور بگڑ گئی۔

سورج نے جب اپنی آنکھیں کھولیں تو کلن نے بھی آنکھیں کھول دیں، کلیسری کی ممتا اس کے چہرے سے چمکنے لگی۔ اور اس نے اپنے شوہر جتن مانجھی کو تاکید کی کہ وہ جلدی بازار جائے اور لکڑیاں بیچ کر اس کا دوا لے آئے۔

جتن لکڑیوں کو لیکر بازار جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ سامنے سے بڑے کسان رگھو یادو کے آدمی آتے نظر آئے اور آتے ہی بغیر کسی تمہید کے کہا کہ '' ساری لکڑیاں دیدے'' کیونکہ بڑے کسان رگھو بابو کا کل رات ہی دیہانت ہو گیا بارش کی وجہ سے واہ سنسکار نہیں ہو سکا اور اس کے لئے لکڑیاں بھی نہیں ہیں۔ کسی ٹال میں بھی لکڑی نہیں ہے۔ بارش نے سب ختم کر دیا۔

دونوں میاں بیوی ان لوگوں کو لکڑیاں لے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے ان سے یہ بھی کہا نہیں گیا کہ کچھ روپیہ دیدو کہ کلن کی دوا لا سکیں۔ جتن نے روپیہ کے لئے کئی دروازہ کھٹکھٹائے مگر اسے کہیں سے روپیہ تو نہیں ملا۔ گھر پر کلیسری کے رونے پیٹنے نے بتایا کہ کلن اب نہیں رہا...... ان لوگوں کے رونے دھونے کو گاؤں کے لوگوں نے بڑے کسان رگھو بابو کی موت کا ماتم سمجھا۔ کوئی پوچھنے نہیں آیا ویسے بھی گاؤں کے ایک کنارے پر بسے ایک دو گھر کے ہریجنوں کے یہاں کون آتا جاتا ہے۔

جتن کے سامنے اب ایک بہت بڑا مسئلہ کلن کے داہ سنسکار کا تھا وہ کہاں سے لکڑیاں لائے کہ اس کا داہ سنسکار ہو کیونکہ زمین گیلی تھی آسمان گیلا تھا زمین اور آسمان کے درمیان اس کا پھوس کا مکان بھی گیلا تھا۔ اس نے آبدیدہ آنکھوں سے دیکھا اسے ہر چیز گیلی نظر آ رہی تھی۔

بڑے کسان رگھو بابو کے چتا میں آگ دے کر لوٹتے ہوئے چند لوگ جتن کے دروازے آئے اور اسے تسلی دے گئے کہ بڑے کسان رگھو بابو کے لئے رونے سے اب کوئی فائدہ نہیں ان کی آتما کی شانتی کے لئے پراتھنا کرو۔

جتن نے دور مرگھٹ پر جلتے ہوئے بڑے کسان رگھو یادو کی جلتی چتا کو غور سے دیکھا۔ اور تیزی سے گھر میں جا کر کلن کی لاش کو سینے سے لگائے دونوں میاں بیوی مرگھٹ کی طرف بڑھ گئے۔

ماسٹر جی

''اگر میں بڑی ہوتی تو میں آپ سے شادی کر لیتی اور آپ کے لئے کھانا پکاتی''
ماسٹر کو مہرو کی بات سن کر کاٹھ مار گیا۔ اسے اس وقت ہوش آیا جب توے سے روٹی کے جلنے کی مہک آنے لگی۔

''میں نے ماں سے سنا ہے کہ لڑکی کی ذات ڑیڑ (ارنڈی کا تیل جس کے پھل سے نکلتا ہے اور جس کا پودا بڑی تیزی سے بڑا ہوتا ہے۔) کی ذات ہوتی ہے''۔ مہرو پر ماسٹر کی کیفیت کا کوئی اثر نہیں تھا وہ کہتی گئی۔ ''میں کھا پی کر جلدی بڑی ہو جاؤں گی ابھی مجھے روٹی بھی پکانی نہیں آتی ...... ماسٹر جی میں آپ کے نہانے کے لئے کنوئیں سے پانی نکال دیتی ہوں۔''

ماسٹر دوڑ کر کنوئیں کے پاس گیا اور اس کے ہاتھ سے بالٹی اور رسی چھین کر ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ''تو اتنی جلدی اسکول کیوں آجاتی ہے وقت پر ہی اسکول آیا کر''۔

''ماسٹر جی! میں اپنے گھر میں کنوئیں سے پانی بھرتی ہوں ......بس بالٹی تھوڑی چھوٹی لا دیجئے۔'' مہرو ماسٹر کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''بدتمیز، ڈھیٹھ لڑکی۔'' ماسٹر بدبداتے ہوئے پھر روٹیاں سینکنے لگا۔

ماسٹر جب بہار کے اس دور افتادہ گاؤں میں آیا تو سب سے پہلے ان کا سامنا مہرو سے ہی ہوا تھا۔ وہ اس وقت چار بکریوں کی رسی کو ایک ساتھ پکڑے گھسیٹتے چلی جا رہی تھی۔ اسکول سے متعلق پوچھنے پر مہرو نے کہا تھا ''آپ میری بکریوں کو پیچھے سے ہانکئے ہم آپ کو اسکول بتا دیں گے۔''

اسکول دیکھ کر اس کا سر چکرا گیا اس اسکول کو کیا کہا جائے۔ کلاس روم میں سوکھے

اپلے، لکڑیاں اور جانوروں کے چارے رکھے تھے تو برآمدے میں گائیں اور بکریاں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ دو کمروں میں تالے ضرور لگے ہوئے تھے اور ایک کے دروازے پر آفس اور ہیڈ ٹیچر لکھا تھا۔ اس گاؤں سے بیس کلومیٹر دور بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر نے اس سے کہا تھا کہ اس اسکول میں بشمول کے پانچ ٹیچر ہو جائیں گے اور ایک چپراسی پہلے سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے وہاں اردو یونٹ قائم ہونے سے وہاں اُس کو اردو ٹیچر کی حیثیت سے بھیجا جا رہا ہے۔

مگر یہاں تو کوئی نہیں، نہ استاد، نہ طالب علم۔ ایک پل کے لئے وہ گھبرا گیا اس کا جی چاہا کہ وہ اس وحشت ناک جگہ سے واپس لوٹ جائے۔ مگر کہاں؟ کس کے پاس؟

جہیز کے باعث اڈھیر ہوتی ہوئی اپنی دو بڑی بہنوں کی شادی کلکتہ میں اپنے دو کمروں کی فلیٹ کے عوض کر کے وہ بے گھر ہو چکا تھا اور جس سے وہ پیار کرتا تھا اس کا پورا کنبہ اللہ کے گھر کا مہمان تھا۔ جادب پور کی ایک ویران مسجد میں دو ہندو بنگالیوں کے ساتھ سکونت پذیر تھے۔ بہنوں کی شادی کے بعد دو روز ہی وہ اس مسجد باڑی میں رہا تھا کہ اسے بہار سرکار میں ایک اردو ٹیچر کی حیثیت سے تقرر نامہ ملا۔

سب سے پہلے اس نے اسکول کے چپراسی کا پتہ لگایا جو کہ اسی گاؤں کا تھا۔ مہاویر یادو کو جیسے ہی معلوم ہوا وہ بھاگتا ہوا آیا اور خوشامدانہ سلام داغتے ہوئے کہا ''چلئے سر: گھر پر چلئے۔''

یہ سب کیا ہے؟'' ماسٹر نے مہاویر کو اسکول کی اس حالت کی طرف متوجہ کیا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا سر:'' مہاویر گھبراہٹ میں بو۔لے جا رہا تھا۔ ''کل ہم سب ٹھیک کروا دیں گے سر، یہ گاؤں والوں کی شرارت ہے سر، آپ لوگ جب یہاں پڑھانے لگیں گے تو یہ اسکول ہی لگنے لگے گا''۔

مہاویر نے اس اسکول سے متعلق استادوں سے متعلق، اس گاؤں اور گاؤں کے لوگوں سے متعلق تفصیل سے بتایا تو ماسٹر نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ یہیں رہے گا بلکہ اسکول میں ہی رہے گا۔

اب یہ اسکول، اسکول سا لگنے لگا تھا مگر اس کے علاوہ کوئی اور استاد نہیں، اور نہ ہی مہرو کے علاوہ کوئی طالب علم .... پندرہ روز اکیلے مہرو کو وہ پڑھاتا رہا اور گھر جا کر لوگوں

کو تعلیم کی اہمیت اور فضیلت بتانے کے بعد پانچ سات بچے اسکول آنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ اس گاؤں کے بیس بائیس مسلمان گھروں سے ایک دو بچے آنے لگے۔ تب ایک روز جے پی یادو نام کا ایک ادھیڑ عمر آدمی اپنے ساتھ ایک بچے کو لے کر آیا اور کہنے لگا ''اسے بھی پڑھایئے''۔

''کیا نام ہے بیٹے۔' ماسٹر نے اس لڑکے سے پوچھا۔

''نریش!'' بچے نے کہا۔

''میں اردو ٹیچر ہوں۔'' ماسٹر نے یادو کو مخاطب کر کے کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' یادو لاپرواہی سے بولا۔ ''اردو بھی تو اس دیش کی بھاشا ہے ـــــ !نا.....؟''

یادو کی فراخ دلی محسوس کر کے ماسٹر نے کہا ''کیوں نہیں۔ آپ لوگ ان ماسٹروں کے خلاف شکایت کیوں نہیں کرتے جو مہینہ بھر گھر میں رہ کر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں اور ایک روز اسکول آکر مہینے بھر کی حاضری لگا جاتے ہیں۔''

''کس کے پاس شکایت کریں؟'' یادو نا امید لہجے میں بولا۔ ''اوپر سے نیچے تک سب ایک ہی ہیں کوئی نہیں سنتا۔''

ماسٹر ہندو بچوں کو اور مستعدی سے اردو پڑھانے لگا جیسے ان بچوں کو اردو گھول کر پلا دینا چاہتا ہو۔ اس درمیان بقیہ چاروں ماسٹر حاضری لگانے اسکول آتے اور ہندو بچوں کو اردو پڑھانے سے منع کرتے۔ مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا ''آپ ان بچوں کو ہندی پڑھایئے وہ اردو پڑھانا چھوڑ دیں گے۔''

مسلمان ماسٹر کی آمد کی خبر جب آس پاس کے گاؤں میں ہوئی تو ایک دن اُن کے پاس کچھ لوگ آئے اور ان کے سامنے کئی تیز چھریاں رکھ دی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' ماسٹر جی گھبرا کر پیچھے کھسک گئے۔

''ڈریئے نہیں مولی ساب''۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ یہ چھری مرگے بکرے کاٹنے کے لئے ہے۔ ہم لوگ دم کئے چھری سے حلال کرتے ہیں ہمارے گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہے۔''

ماسٹر ہکا بکا سکتے کے عالم میں ان لوگوں کو دیکھتا سنتا رہ گیا۔ کوس بھر دور مسجد کے امام

ساب ہماری چھریوں پر دم کر دیتے ہیں جس سے ہم لوگ تین مہینہ تک مرگے بکرے حلال کرتے ہیں، سرف بکرید میں امام ساب خود آ کر بکرا کاٹ جاتے ہیں۔''

ماسٹر نے ایک گھنٹہ میں ان سارے لوگوں کو حلال جانوروں کے ذبح کرنے کی نیت رٹا کر سکھا دی اور تاکید کر دی کہ دم کئے چھری سے ذبح کیا ہوا حلال جانور بھی حرام ہو جاتا ہے۔

دینی و سماجی اعتبار سے ماسٹر نے خود پر بہت سی زمہ دیاریاں اوڑھ لیں اور آس پاس کے گاؤں میں گھوم گھوم کر اصلاحی کام کرنے لگا۔ جس کا خاصا اثر پہلے عورتوں پر پڑا وہ پاکی ناپاکی کو خوب اچھی طرح سمجھنے لگیں اور مردوں کی طرح مگر چھپا کر لوٹے میں پانی لے کر حوائج ضروریہ کے لئے دور کھیتوں میں جانے لگیں۔ سب سے بڑی تحریک یہ ہوئی کہ سب میں اچھائی کی طلب آ گئی۔ اس طلب میں کئی گاؤں میں مدرسے کھل گئے۔ ودیا مندر پاٹھ شالے کھل گئے۔ مردوں میں چھوٹے پریوار اور کنڈوم کی اہمیت سمجھ میں آ گئی۔ ساتھ ہی لڑکیوں کی پیدائش کو معیوب سمجھنا چھوڑ دیا۔ لوگوں پر مہرو کا ساتویں بورڈ کا امتحان اول نمبر سے پاس ہونے کا بھی زبردست اثر رہا۔ مہرو کا باپ چھاتی ٹھوک کر لوگوں سے کہتا ''کوئی مائی کا لعل ہے جو میری مہرو جیسا پڑھا ہے''۔ ساتھ ہی ماسٹر کی بھی تعریف کرتا کہ اس نے یہاں اس اسکول سے مہرو کو پانچویں پاس کرایا پھر شہر میں لے جا کر ساتویں بورڈ کا امتحان پاس کروایا۔ مگر وہ کبھی کبھی پریشان بھی ہو جاتا کہ ساتویں پاس مہر سے کون شادی کرے گا؟

''مہرو کیا بات ہے؟'' ماسٹر نے مہرو کو اسکول میں ناوقت دیکھ کر دریافت کیا۔

''میں اب نہیں پڑھوں گی۔'' مہرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

میرے بابا کہتے ہیں زیادہ پڑھی لکھی لڑکی کی شادی مشکل سے ہوتی ہے اور ماں کہتی ہے کہ میں سیانی ہو گئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے بابا کو سمجھاؤں گا، بس تم پڑھائی پر دھیان لگاؤ تمہیں اگلے سال میٹرک کا پرائیویٹ سے امتحان دلواؤں گا۔ ماسٹر نے مہرو کو سمجھایا۔ ''اور تم ابھی بچی ہو سمجھیں''۔

''نہیں، ماسٹر!'' اس نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ ''ماں کہتی ہے جس لڑکی کو

پھول' شروع ہو جائے وہ سیانی ہو جاتی ہے اور مجھے تو تین سال سے 'پھول' ہو رہے ہیں''۔

ماسٹر نے پہلی بار مہرو کو غور سے دیکھا وہ ہر زاویہ سے مکمل خوبصورت دوشیزہ نظر آئی تھوڑی دیر کے لئے ان کی آنکھوں میں گم گشتہ محبت کی شبیہہ جھلملا اٹھی۔ شنو جسے اس نے پایا مگر پا کر بھی نہ پا سکا۔ اس کی تقرری کی خبر سے شنو اس قدر خوش ہوئی تھی کہ جیسے اسے دونوں جہاں اور اس کی خوشیاں مل گئی ہو۔ جمیل نے بھی اُسے اپنی بانہوں میں بھر کر کہا تھا کہ وہ جلد ہی اس جہنم نما شہر کلکتہ سے اسے لے جائے گا جہاں عام آدمی ڈربے نما کمروں میں کئی کئی لوگ ٹھسے رہتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر کھاتے ہیں فٹ پاتھ پر سوتے ہیں اور فٹ پاتھ پر نہاتے ہیں اور نہاتے ہوئے کوبلہ گاڑی اٹھا کر لے جاتی ہے۔

''مگر ہمیشہ کے لئے کلکتہ چھوڑنا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔'' شنو نے کہا تھا۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ یہ کلکتہ ام البلاد ہے جہاں آج بھی انسانیت زندہ ہے محبت ہی محبت ہے۔'' شنو کہتے کہتے جذباتی ہو گئی۔ ''جہاں ہگلی ندی ہے۔ جس کا پانی جس کے کنارے ہماری محبتوں کی امین ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں نذرل وحشت، ٹیگور کے گیت گونجتے ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں ہماری تمہاری محبت کے بے شمار الفاظ تیر رہے ہیں، ذرا غور سے سنو تو! برسوں پہلے جب تم نے مجھے بدر النساء کی بجائے شنو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ شنو، شنو، شنو!! میں آج بھی سن رہی ہوں۔''

''بس بس محترمہ زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جمیل اس کے ہونٹوں کو لطیف سا بوسہ دے کر کہا۔ مجھے جو بھی تنخواہ ملے گی تمہیں بھیجتا رہوں گا جب کوئی ایک کمرہ لینے کے لائق روپیہ جمع ہو جائے پھر ہم شادی کریں گے۔''

جمیل نے اپنی پہلی تنخواہ منی آرڈر کر دیا جس کی رسید اسے پورے دو مہینہ بعد ملی۔ اس کے بعد بہار سرکار نے ماسٹروں کی تنخواہ سات مہینہ تک روک دی اس درمیان جمیل نے کئی خط شنو اور اس کے گھر والوں کو لکھ کر روپیہ منگوائے مگر روپیہ تو نہیں آیا مگر ایک خط آیا جس میں اس کے مجبوری میں مانگے گئے روپیہ کو جہیز سمجھا گیا۔ شنو کا رشتہ کہیں اور کر دیا گیا۔ جمیل تو مر ہی جاتا مگر مہرو کے گھر والوں نے ہر طرح سے کفالت کی اور مہرو نے تو حد ہی کر دی ایک

روز ماسٹر کو پانچ روپیہ دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ رقم آپ قمیص کی پاکٹ سے ملی۔ آپ کے کپڑے گھر پر میں ہی دھوتی ہوں اور دھونے سے پہلے پاکٹوں کو چیک کرتی ہوں ہے نا اچھی عادت ماسٹر جی۔ ''آپ سے ہی سیکھا ہے''۔

ماسٹر نے اپنی یادداشت پر زور ڈالا اسے کچھ یاد نہیں آیا۔

''ماسٹر۔ مہرو تحکمانہ انداز میں بولی۔ ''اس روپیہ سے داڑھی، حجامت بنوا لینا چہرے پر گھاس پھوس اُگ آئے ہیں۔''

ماسٹر مسکرایا اور مہرو کی پیشانی کو چوم لیا۔

''چبھتی ہے ماسٹر جی۔'' مہرو بلبلا کر ہٹ گئی۔ ''سب صاف کروالینا۔''

ماسٹر نے چاہا کہ داڑھی رکھ لے تاکہ داڑھی کا بڑھنا چھپا رہے۔ مگر مہرو کی بات سے مغلوب ہو کر شیو کرا آیا۔''

ایک روز اور کچھ روپے دیتے ہوئے مہرو نے پرانا بہانا بنایا تو ماسٹر نے اسے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا'' میں ایک ایک پیسہ کے لئے ترس گیا ہوں اور تمہیں میرے کپڑے میں نوٹ ملتے ہیں.............بتا روپیہ کہاں سے لائی.............؟ چوری کر کے۔''

''یہ روپے چوری کے نہیں ہیں'' مہرو جلدی سے بولی۔ یہ میرے ہیں، میں نے دھان لوڑھ کر یہ روپے کمائے ہیں۔''

''معاف کرنا مہرو!'' ماسٹر اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔ ''اس روپیہ سے تم مٹھائی کھالینا!''

''نہیں ماسٹر جی۔'' مہرو اطمینان سے بولی۔ بہت دنوں سے آپ بازار نہیں گئے ہیں آپ بازار جانا وہاں ہوٹل میں چائے پینا، پھر پان کھانا اور سگریٹ پینا۔''

''پاگل ہے تو! میرا اتنا خیال کیوں رکھتی ہے، ماسٹر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''معلوم نہیں؟'' مہرو نے معصومیت سے کہا اور چلی گئی۔

ماسٹر کی آنکھیں ماضی سے لوٹتے لوٹتے چھلک پڑیں جیسے مہرو نے اپنے آنچل میں جذب کر کے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''آپ نہ روئیں ماسٹر جی میں پڑھوں گی۔ اور جتنا کہیں گے میں پڑھوں گی مگر آپ کو مجھ سے شادی کرنی پڑے گی۔''

ماسٹر نے جھٹکے سے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بچپن سے شادی کرتی آرہی ہو آخر مجھ میں ہے کیا؟''

''بہت کچھ! مگر مجھ کو معلوم نہیں۔'' وہ بھولے پن سے بولی۔

''میں تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں مہرو۔'' ماسٹر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو میرے بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔''

''آپ بس مجھ سے پانچ چھ سال کے بڑے ہیں۔'' مہرو مزاحیہ رنگ اختیار کر گئی۔ ''اور آپ کے سارے سفید بال نوچ دوں گی۔''

''پھر تو میں گنجا ہو جاؤں گا۔'' ماسٹر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اچھا ہوگا، ایک چاند آسمان پر اور ایک میرے پاس رہے گا۔'' مہرو اس کے ماتھے کو چوم کر بھاگ گئی۔

ماسٹر اسے جاتے دیکھنے کے لئے باہر تک آگیا، گاجے باجے کے ساتھ مہرو پالکی میں اپنی سسرال جارہی تھی۔

دریچے کی دھوپ

وہ افسانہ نگار ہے مگر اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ افسانے لکھتا نہیں ہے بلکہ افسانہ جنتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ کوئی عورت بچہ جنتی ہے۔ جب کوئی افسانہ اس میں پرورش پانے لگتا تو اس کی شخصیت بالکل حاملہ عورت کی طرح بوجھل یا قریب قریب بدصورت ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ جاتی ہے چین اسمو کر ہو جاتا ہے۔ بے چینی کے عالم میں یہاں سے وہاں تک کبھی تیز ڈگ کبھی آہستہ قدم چلتا اور چلتے چلتے بے ترتیب جہاں تہاں بیٹھ جاتا اور تنہائی پسند ہو جاتا اور جب افسانہ جننے لگتا یعنی لکھنے بیٹھتا تو کرداروں کے مکالمے زور زور سے خود کلامی کے انداز میں خود ہی بولنے لگتا جیسے کہ عورت دردزہ کے عالم میں چیخنے لگتی ہے اور اس کا مرد کا منہ نوچ لینا چاہتی ہے جو اس کے اس جان لیوا درد کا باعث بنتا ہے وہ بھی اسی انداز میں غصہ سے کبھی کبھی اپنا قلم پٹخ دیتا ہے۔ سماج کے چہرے سے نقاب نوچ دینا چاہتا ہے۔ سماج کے ناسور سفید پوشوں کو ننگا کر دینا چاہتا ہے۔

مگر گزشتہ دنوں خالد کے دو افسانوں کا اسقاط ہو گیا ابھی ابھی جو اسقاط ہوا اس میں مجھے زندگی کی رمق نظر آتی ہے۔ میں اس کی ہی پرورش شروع کرتا ہوں۔

''بانجھی ...... بانجھ!'' کا طعنہ سنتے سنتے رما کے کان پک گئے تھے مگر وہ بیچاری کیا کرتی۔ کون عورت ماں بننا نہیں چاہتی۔ ماں بننے کے لئے مہنگے علاج کے علاوہ ٹونے

ٹوٹکے کئے ۔ پیروں ، فقیروں کے قدموں میں سر جھکائے ۔ سادھوں سنتوں کی سیوا کی ، درگاہ، مٹھ مزاروں پر جا کر منتیں مانگیں مگر کہیں سے بھی اسے اولاد کی امید پوری نہیں ہوئی ۔ اس کی ساس جیسے جیسے بوڑھی ہوتی جارہی تھی اس کا طعنہ اور طنز اور بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی دوسری شادی کی کوشش بھی کی مگر آنند نے سختی سے منع کیا تو ماں نے اسے نامرد ہونے کا طعنہ دے دیا۔

آخر آنند نے تنگ آ کر کلکتہ میں ہی بڑی کوشش کے بعد ایک گنجان محلہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ کسی طرح حاصل کیا اور الگ رہنے لگا۔ زندگی کی بنیادی وفطری ضرورت صاف ہوا، پانی ، دھوپ کی کمی کے باوجود رما بھی خوش تھی کیوں کہ ایک نئی زندگی کی آمد کا احساس اس کے ابھرے ہوئے پیٹ سے خوب ہونے لگا تھا۔ آنند کو بھی اس کے ابھرے پیٹ سے والہانہ عشق تھا کیوں کہ عورت جس طرح بہر حال میں ماں بننا چاہتی ہے اسی طرح مرد بھی اپنے کندھے پر مرد ہونے کا بوجھ لینا چاہتا ہے۔ آنے والے وجود کو آنند یقیناً کندھے پر ہی اٹھا کر اپنی ماں کے پاس جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

''تمہیں اس حال میں روشنی کی موت کا اثر اتنی سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے؟ آنند نے رما کو سمجھاتے ہوئے کہا'' روشنی ،تمہاری کوئی نہیں تھی وہ تو بس ہمارے پڑوس کی ایک ننھی سی خوبصورت سی گڑیا تھی ، جو مرگئی۔''

''کیوں مرگئی روشنی؟ رما کی آواز دل کی گہرائیوں سے ابھری۔

''اس لیے کہ اس کی زندگی اتنی سی تھی؟'' آنند نے معمولی ڈھنگ سے جواب دیا۔

''نہیں !نہیں !!'' رما چیخ کر بولی۔'' اسے تم نے ہم نے سب نے مل کر مارا ہے''

''کیا بکتی ہو؟'' آنند نے تلخی سے ردعمل ظاہر کیا۔

''ہاں! ہم سب نے مل کر مارا ہے...... روشنی کو دمہ ہو گیا تھا۔ اسے دمہ کیوں ہو گیا تھا؟'' رما نے اپنے آنچل سے آنسو پوچھتے ہوئے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔'' اس لئے کہ اسے صاف ہوا نصیب نہیں تھی ۔ وہ زہر پی رہی تھی ۔ وہ ننھی سی جان روز بیس سگریٹ کا دھواں پی رہی تھی ۔اس فضا کی آلودگی کا ذمہ دار کون ہے......؟ کیا ہم سب نہیں؟؟''

''مگر......''! آنند سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

''آنند!'' رما نے متوجہ کیا۔'' اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے......''

''کیا فیصلہ کیا ہے؟'' آنند بے چین ہو کر جلدی سے بات کاٹ کر دریافت کیا۔
''فیصلہ کیا ہے......'' رما اٹک اٹک کر مگر مستحکم انداز میں بولی...... ''کہ اپنا حمل گرادوں گی!''
''واٹ؟'' آنند کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔اس کا سر چکرا گیا۔
''ہاں آنند. رما سنبھل کر ایک ایک لفظ کو اجاگر کر بولنے لگی۔''میرے پیٹ میں جو بچہ ہے اس سے تو ثابت ہو گیا کہ میں بانجھ نہیں اور تم نامرد نہیں......آنند! ذرا سوچو ہمارا بچہ کہاں کھیلے گا؟
آنند کی ڈیٹ کے بعد جو خاموشی پیدا ہوئی اس میں کئی طرح کا بے ہنگم شور شامل ہو گیا......آنند نے پھر رما کو مناتے ہوئے کہا''تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟''
''کیا غلط سوچتی ہوں؟ آنند!'' رما اپنے گال کو سہلاتے ہوئے بولی۔''ہر ماں باپ اپنی اولاد کی زندگی وصحت کے بارے میں سوچتے ہیں،سو میں نے بھی سوچا۔سوچو بچے آج کہاں کھیلیں؟ان کا کھیلنا ان کی نشو ونما اچھی صحت کے لئے ضروری ہے کہ نہیں...... جب میں بچوں کو سڑک پر کھیلتے دیکھتی ہوں تو میرا دل دہل جاتا ہے بھاگتی دوڑتی بے شمار گاڑیاں جو موت کی شکل ہے ان سے اگر بچے بچ جاتے ہیں تو ان کے اگلے زہر سے نہیں بچ پاتے......بولو آنند ہمارے بچے کہاں کھیلیں گے؟''
''ہمارا بچہ کمپیوٹر سے اس کے اسکرین پر کھیلے گا۔'' آنند نے رما کی بحث سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ گیا۔
''اور کم عمری میں ہی اس کے آنکھوں پر بھاری چشمہ چڑھ جائے گا۔'' رما نے طنزاً کہا اور پھر سنجیدہ ہو گئی۔''آنند!اپنے بچے کی لمبی زندگی تندرست مضبوط جسم و دماغ کے لئے مجھے گاؤں بھیج دو......ذرا غور کرو آنند!کس دھوپ میں اپنے بچے کی ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں کو مضبوط کرنے کے لئے تیل مالش کریں گے؟ کیا اس دریچے کی دھوپ میں جو چند منٹوں کے لئے آتی ہے؟ جس کی تپش سے تمہارا رومال بھی نہیں سوکھتا!''
خالد نے اپنے اس افسانہ کو اسی جگہ ادھورا چھوڑ دیا۔لیکن میں نے جب اسے کئی بار پڑھا تو لگا کہ یہ افسانہ اپنے آپ میں مکمل ہے مگر پھر بھی میں یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ کیا آنند نے رما کو گاؤں بھیجا......؟ اگر میں آنند کی جگہ ہوتا تو یقیناً رما کو اپنی تندرست اولاد

کے لئے گاؤں ضرور بھیج دیتا بلکہ دنیا میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ اپنی اولاد کے لئے لوگوں نے دنیا تک کو چھوڑا ہے میں شہر کو چھوڑ دیتا...... میرے اس فیصلہ کو آپ جذباتی کہہ کر رد کر سکتے ہیں مگر کیا......؟

قوس قزح کا آٹھواں رنگ

اس روتی بلکتی بڑھیا کو میں نظر انداز نہیں کر سکا۔ وہ یقینی طور پر اس بے ہنگم کمبھ میلہ میں اپنے کسی عزیز سے بچھڑ گئی تھی۔ میں نے اس کے عزیز کا نام پوچھا اور وقفہ وقفہ کے بعد کئی بار لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرواتا رہا مگر اسے لینے کوئی نہیں آیا۔ آخر اسے مسنگ سینٹر کی طرف لے چلنے لگا تو اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں اسے کہاں لئے جا رہا ہوں؟

میرے یہ کہنے پر کہ میں اس سے خیمے میں لے جا رہا ہوں جہاں اس میلہ میں گم شدہ لوگوں کو رکھا جاتا ہے اور پھر بعد میں ان کے پریوار والوں کو سونپ دیا جاتا ہے اور جو لوگ یہاں نہیں مل پاتے انہیں میلہ ختم ہونے کے فوراً بعد گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔

''مگر میلہ ختم ہونے میں تو ابھی ڈیڑھ مہینہ باقی ہے۔'' بڑھیا نے مایوسی سے کہا۔

''تو کیا ہوا تمہارا بیٹا تمہیں لینے آ جائے گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''آنا ہوتا تو وہ آ گیا ہوتا۔'' بڑھیا نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''میں کل سے آج تک وہیں ہی تھی...... مگر میرا بیٹا مجھے ڈھونڈھ ضرور رہا ہوگا، وہ تھوڑا اونچا سنتا ہے اس لیے میرے متعلق اعلان سن نہیں پایا ہوگا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ اس نے میرے بغیر کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔'' اور وہ پھر رونے لگی۔

''تم نے کچھ کھایا۔ ماں!'' مجھے اس بڑھیا پر رحم آ گیا مگر نہ جانے کون سے جذبہ کے

زیر اثر اسے ''ماں'' کہہ گیا۔

اس بڑھیا نے نظر اٹھا کر دیکھا اس کی کمزور آنکھوں میں ممتا کی بوندیں آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھیں۔ ''میرا بیٹا جئے! جب بھی کہیں باہر سے آتا مجھ سے ایسے ہی پوچھا کرتا تھا تم نے کچھ کھایا ماں!''

میں اسے شہر کے ایک اچھے سے ہوٹل میں لے گیا۔ اسے کھاتے دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنی ماں کو کھلا رہا ہوں میرا دل بہت خوش تھا کہ مجھے ایک بزرگ عورت کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو یقیناً اس عمر کی ہوتی۔

اس کے ہاتھ میں دو سو روپیہ رکھتے ہوئے کہ ''چلو ماں تمہیں اسٹیشن پر تمہارے گھر جانے والی ٹرین پر سوار کرادوں''۔

''میں بوڑھی عورت...... آنکھیں بھی کمزور، اگر پھر کہیں گم ہوگئی تو...... دفعتاً ایک خوف اس کے چہرے کی جھریوں میں نمایاں ہوگیا۔ اس بار گم ہوئی تو شاید پھر تم جیسا کوئی اچھا بیٹا نہیں ملے گا۔''

''ماں! میں نوکری پیشہ ہوں مجھے چھٹیاں بہت کم ملتی ہیں اور پھر بہار کے جس علاقے سے تم آئی ہو میں اس علاقے سے بالکل ناواقف ہوں۔'' ''میں نہیں پہنچ سکتا''۔ میں نے اپنی لاچاری دکھائی۔ ''بیٹا! پھر مجھے تروینی پر چھوڑ آؤ تاکہ میں گنگا جمنا سرسوتی کی گود میں ہی پناہ لے لوں۔'' اس کے آنکھوں میں پھر آنسو لرزنے لگے۔

میں بہت طرح کے اندیشوں میں گھرا اسے اپنے گھر لے آیا۔ میری بیوی نے اسے دیکھتے ہی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور جب اسے بڑھیا میری بیٹی سمجھ کر مجھ سے مخاطب ہوئی تو وہ بھڑک اٹھی۔ بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔ اور پھر بڑھیا کو بتایا کہ وہ میری بیٹی نہیں بیوی ہے تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

میری اور میری بیوی کی عمر میں ایک طویل عمر فاصلہ ہے۔ اگر میں کلکتہ میں ہی رہتا تو یقیناً یہ فاصلہ اتنا دراز ہوتا کہ مجھے نیم تو تلا گھاٹ کی سیج ہی نصیب ہوتی...... ایک اچھا گھر ایک خوبصورت بیوی خوبصورت ذہین بچے کی خواہش مجھے ہمیشہ رہی۔ کلکتہ شہر میں خوبصورت بیوی ملنا تو آسان ہے مگر گھر کا ملنا بلکہ ایک کمرے کا بھی ملنا بہت مشکل ہے۔ وہ تو بھلا ہو میرے پرانے دوست یونس بھائی کا جس نے میرے بالوں میں چاندی دیکھ کر رحم

آ گیا اور اپنے ساتھ الہ آباد لا کر ڈرائیوری سکھا دی...... اب میں ایک غیر ملکی کمپنی میں نوکر ہوں میرے پاس دو کمرے اور ایک برآمدے والا فلیٹ ہے میں تو اسے مکان کہوں گا۔ ایک خوبصورت کم عمر بیوی اور چھ ماہ کا ایک خوبصورت گول مٹول بیٹا ہے۔

میری خواہشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میری بیوی نے اس بڑھیا کے لئے سونے کا انتظام برآمدے میں کیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ کہیں بڑھیا برآمدے میں سردی سے ٹھٹھر کر مر نہ جائے۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر بڑھیا کے پاس گیا وہ سردی سے کانپ رہی تھی اس جاگتی کو جگایا اور دوسرے کمرے میں تالا کھول کر چپکے سے اسے سلا کر تاکید کی وہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔

''میں اندر سے دروازہ بند کرلوں گی۔'' بڑھیا نے آہستہ سے کہا۔ ''بیٹا! تم باہر سے کنڈی اور تالا لگا دینا۔''

اس سرد رات میں شرمندگی کے پسینہ سے نہا گیا۔ مجھے اپنی بیوی پر بہت غصہ آیا۔ وہ اس بڑھیا کو چور سمجھ رہی تھی۔

شام کو جب میں گھر واپس آیا تو میرا منا اس بڑھیا کی گود میں کھیل رہا تھا اور میری بیوی بڑی خاموشی سے قریب بیٹھی اس کی باتیں شاید منا کی پرورش سے متعلق کوئی نصیحت سن رہی تھی۔ میں نے اچھی طرح محسوس کیا کہ اس بڑھیا اور میری بیوی میں دوستی منا کے ہی وسیلے سے ہی ہوئی ہوگی۔ منا کا جسم تیل سے چپڑا ہوا تھا اور اس سے سرسوں تیل و جائفل کی تیز مہک اٹھ رہی تھی۔

میری بیوی نے بتایا کہ وہ بڑھیا منا کو دن بھر میں کئی کئی بار جائفل اور سرسوں تیل سے مالش کرتی ہے اور اب منا چارپائی پکڑ کر کھڑا ہونے لگا ہے۔ مجھے اس بات سے بیحد خوشی ہوئی اور ساتھ ہی حیرت بھی کہ کہاں بڑھیا اپنے بیٹے کے غم میں رو رہی تھی کہ اس کا بیٹا پاگل کی طرح ڈھونڈھ رہا ہوگا اس کے غم میں اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ہوگا اور اب اتنی مطمئن لگ رہی ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کوئی غم ہی نہیں۔

بڑی مشکل سے میں نے ایک روز کیلئے سوموار کو دفتر سے چھٹی لی اور سنیچر کی رات کو ہی اس بڑھیا کو لے کر گیا شہر آ گیا۔ اس بڑھیا کی ہدایت کے مطابق ایک چھوٹی سی ۲۰۷ ماڈل بس سے فتح پور آیا۔ وہاں سے پیدل ایک گاؤں پہنچے۔ گاؤں میں ادھر ادھر گھومنے کے بعد

اس بڑھیا نے کہا کہ یہ اس کا گاؤں نہیں ہے، ہم پھر واپس فتح پور آئے اور وہاں سے تروان پہنچے۔ بڑھیا نے پھر کہا یہاں بھی اس کا گھر نہیں ہے۔ وزیر گنج، نوادہ، ہسوا، شیخ پورہ، دھوسری اور پھر واپس گیا۔ میں بڑھیا کی اس حرکت سے ذہنی اور جسمانی طور پر بہت پریشان ہو گیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے گیا میں چھوڑ کر واپس الہ آباد چلا جاؤں گا۔

اس کا گھر چاہے جہاں کہیں ہو وہ خود چلی جائے۔ میں دو دن میں اس کی رکت سے تھک کر بہت دکھی ہو گیا ہوں۔ پوروا ایکسپریس کی آنے کی خبر ہو چکی تھی میں نے جلدی سے دو سو روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور خود ٹکٹ لینے کے لئے چل پڑا۔

''بیٹا! بیٹا'' کہتے ہوئے بڑھیا نے میرا تعاقب کیا۔

''اب کیا ہے؟'' میں ڈانٹ کر پوچھا۔

''بیٹا! مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلو۔'' بڑھیا نے میرے پیر پکڑ لیئے۔

''تمہارے گھر نوکرانی بن کر رہوں گی، تمہارے بیٹے کی پرورش کر جلدی بڑا کر دوں گی۔''

''تمہارا تو گھر ہے، بہو ہے، بیٹا ہے۔ تمہارے بغیر تو گھر میں کوئی کھاپی بھی نہیں رہا ہوگا۔ تمہارا بیٹا ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا ہوگا۔'' میں نے طنز کرتے ہوئے اسے جھٹک دیا۔

''میرا گھر ہے، بیٹا، بہو، چار پوتی ایک پوتا ہے مگر میرے غم میں کوئی بھوکا نہیں ہوگا نا ہی میرا بیٹا...... '' بڑھیا کہتے کہتے رکی میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور پھر کہا۔'' نا ہی میرا بیٹا مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میرے بیٹے ہی نے مجھے کمبھ میں لا کر میری مرضی سے چھوڑ دیا تھا۔''

بڑھیا کے اس انکشاف پر میں حیران رہ گیا...... اس نے مزید اس طرح بتایا کہ وہ برہمن ہے۔ پوجا پاٹھ کروا کر لوگوں سے دان دکشنا حاصل کرنا ہی اس کا پشتینی کام رہا ہے۔ اس کے شوہر پنڈت گری راج شرما نے دان دکشنا حاصل کر کے کچھ زمین جائداد حاصل کی اور اپنے اکلوتے بیٹے جے راج کو اپنے کل کی پرمپرا کو توڑتے ہوئے پنڈت کی تعلیم سے الگ تعلیم دلوانا شروع کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ آنے والے دنوں میں پنڈت گری بھیک مانگنے جیسی ہی ہو جائے گی۔ اور اس نے اپنے اس اکلوتے جے راج کو اس پیشہ سے دور رکھنے کی پوری پوری کوشش کی۔ پنڈت گری راج جب بستی بستی گاؤں گاؤں جانے سے معذور ہو گیا تو

دان دکشنا بھی آنا بند ہوگئی بھولے بھٹکے ہی کوئی نمشکار کرنے آجاتا تو کچھ مل جاتا۔

جے راج نے جیسے تیسے بی۔اے کیا اور نوکری کی تلاش شروع کردی۔نوکری نہیں ملی تو اس نے بھی پنڈت گری کا پشتینی کام شروع کر دیا مگر اسے وید پران کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ نہ وہ ہاتھ کی ریکھائیں پڑھ سکتا تھا۔ نا ہی کسی کی جنم کنڈلی بنا سکتا تھا۔ پھر بھی وہ گری راج شرما کے بیٹا ہونے کے نام پر کچھ حاصل کر لیتا تھا۔ جس سے گھر بہت مشکل سے چلتا۔ برہمن ہونے کی وجہ سے آس پاس کے لوگ عزت تو خوب کرتے تھے مگر جے راج یا اس کی بیوی یا ماں کو کوئی کام نہیں دیتے، انہیں پاپ کا ڈر تھا۔

جے راج کی تین بیٹیاں تلے اوپر جوان ہوگئیں۔ دو کی ہی شادی میں گری راج کی دان دکشنا میں حاصل جائیداد جہیز کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ تیسری کی شادی گپ چپ بغیر جہیز کے ایک مسلمان لڑکے سے کردی۔ مگر یہ خبر کب تک چھپی رہتی جیسے ہی لوگوں کو معلوم ہوا اس کے گھر کی مکمل طریقہ سے حقہ پانی بند کر دیا گیا۔ جو تھوڑا بہت دان دکشنا مل جاتی تھی وہ بھی اب بند ہوگئی۔ بھوک نے ہی پریاگ کی راہ دکھائی تاکہ تروینی میں لپت ہوجاؤں یا کسی بھلے مانس کے کام آؤں۔

اب اس کا بیٹا جے راج اسی گیا اسٹیشن کے باہر رکشا چلاتا ہے اور اس نے سامنے اشارہ کیا۔

اتھو پیا کا بھوکا جیسا دکھنے والا انسان ہماری طرف حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ بڑھیا دو قدم اس کی طرف بڑھی جے راج تیزی سے اس کی طرف رکشہ چھوڑ کر دوڑ پڑا۔ دونوں ماں بیٹے گلے لگتے ہی گنگا جمنا ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اور سرسوتی میرے من میں۔ مجھے اس وقت مہ جبیں ناز عرف مینا کماری کی وہ نظم شدت سے یاد آنے لگی جس میں کہا گیا ہے ''محبت قوس وقزح کی طرح کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کے دونوں کنارے درد کی اتھاہ گہرے سمندر میں ڈوبے ہیں۔''

ٹون ٹون......انٹرویولیٹر

آج اس کا من بہت بھاری تھا وہ بوجھل قدموں سے چل کر دفتر کے باہر آیا اور غیر ارادی طور پر آسمان کے طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کسی پناہ کے لئے ادھر سے ادھر بھٹک رہے تھے جیسے اس کے دل میں کرن کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کی تلخ وشیریں یادیں منڈلا رہی تھیں۔

جسونت نے کسی سواری کے بجائے پیدل ہی گھر جانے کا ارادہ کیا اور یادوں کے اتھاہ گہرے سمندر میں بغیر کسی پتوار کے ہچکولے کھاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں'' اچانک ماضی کی وادیوں سے کرن کی آواز اس کے کانوں میں گونج گئی......کرن کے چہرے پر خوشیوں کی بے شمار کرنیں رقصاں تھیں۔ اس کے خوبصورت ونرم ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹوں کے دائرے بن رہے تھے۔

آج کرن کے جسم کا ہر عضو اس کے حسن کا گیت گا رہا تھا۔ گلابی شلوار سوٹ میں اس کا وجود کھلی دھوپ میں سونے کی طرح دمک رہا تھا اور ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ مگر جسونت زاہد خشک کی طرح اس سے بے نیاز تھا۔

''جیسی ہو، ویسی ہی لگ رہی ہو۔'' جسونت نے کہا ''تم بہت ڈرائی ہو، بالکل اپنے سبجکٹ کی طرح......تم تعریف کے چند الفاظ نہیں کہہ سکتے'' کرن کا مسکراتا ہوا وجود ایک لمحہ

کے لئے مایوسیوں کے اندھیرے غار میں ڈوب گیا۔ اور ایک مجروح عورت کی آواز ابھری۔ '' آج کوی تہوار نہیں کوئی جشن نہیں، صرف تمہیں دکھانے کے لئے یہ قیمتی اور خوبصورت لباس پہنا ہے امپورٹڈ پرفیوم استعمال کیا ہے۔ یہ خوبصورت آویزے یہ لونگ یہ ہری چوڑیاں کیوں پہنیں؟''

آج میں بہت خوش تھی۔ تمہارے تعریفی جملے کے ہر لفظ ے بدلے تمہیں ایک بوسہ دیتی...... تم جاہل ہو، ایک عورت کو نہیں پڑھ سکتے...... تمہاری جگہ اگر کوئی اجڈ جاہل بھی ہوتا تو اتنا ضرور کہتا۔ '' تم خوبصورت لگ رہی ہو۔''

'' تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' جسونت کے ہونٹوں پر ایک شکست خوردہ مسکراہٹ لرز رہی تھی۔

'' بدھوا! '' کرن نے اپنی مہکتی صندلی باہیں اس کے گردن میں ڈال دیں'' تمہارے اسی بھولے پن پر نہ جانے کیوں مجھے بہت پیار آتا ہے۔''

'' آؤ تمہیں میں پیار سکھادوں''...... روپ محل ریستوران کے پرسکون ماحول میں لتا منگیشکر کی رومان پرور آواز تیر رہی تھی اور کرن کے پاؤں تھرک تھرک کر جسونت کے پاؤں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اس کے ہونٹ شرارت سے مسکرا رہے تھے اور اس کی سمندر جیسی گہری آنکھوں میں سے شوخی ہچکولے لے رہی تھی۔

'' ارے رے یہ کیا کر رہی ہو؟'' جسونت نے جھینپتے ہوئے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا مگر کیبن میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ یا تو تم بہت زیادہ شریف ہو یا بننے کا ڈھونگ کرتے ہو۔ آخر تم مجھے نظر انداز کیوں کرتے ہو؟'' کرن سراپا سوال بن گئی۔

'' چلو، اب چلتے ہیں۔'' جسونت کو کرن کی حرکت سے ڈر سا لگنے لگا وہ اٹھنا ہی چاہ رہا تھا کہ کرن نے اسے ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچ لیا۔ ٹیبل پر رکھی کافی کی خالی پیالیاں چھناک سے بج اٹھیں۔

'' کیا چاہئے صاحب؟'' بیرا جلدی سے اندر جھانکا، پیالی الٹ جانے سے کافی کی کچھ مقدار ٹیبل پر پھیل چکی تھی اور بھرے ہوئے اسٹرے سے بجھی ہوئی سگریٹ کے دھویں کی پتلی پتلی لکیریں کانپ رہی تھیں اور تنہائی کا کرب اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔

'' ابھی تک میم صاحبہ نہیں آئیں؟'' بیرا حالات کو سمجھ چکا تھا کیوں کہ اس سے قبل

جسونت کبھی تنہا اس ریستوران میں نہیں آیا تھا۔ ''سنو؟'' جسونت نے بیرا کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا'' کیا بات ہے صاحب؟'' بیرا حیرت زدہ اس کے روبرو کھڑا تھا۔

''اچھا بتاؤ۔'' جسونت اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ جو کچھ پوچھے گا بیرا سچ سچ بتائے گا۔'' کیا میم صاحب مجھے پیار کرتی تھیں؟'

''تھیں ی ی! بیرا کے لہجے میں استعجاب تھا۔'' کیا ہوا میم صاحب کو؟''

'' کچھ نہیں، تم بتاؤ؟'' جسونت کا لہجہ سپاٹ تھا۔

'' میم صاحب آپ کو بہت پیار کرتی تھیں۔'' بیرے نے زبان سے یہ مختصر سا جملہ ادا کیا۔''

''تم جھوٹ کہتے ہو؟''

'' گنگا جی کی قسم؟'' بیرا اسے یقین دلانے کے لئے جلدی سے بولا۔'' جھوٹ نہیں صاحب وہ آپ کو بہت پیار کرتی ہیں''۔

جسونت جلدی سے بل ادا کر کے باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں بیرے کا مکمل یقین مسلسل گونج رہا تھا اور سوچ رہا تھا اگر بیرا سچ کہتا ہے تو کرن نے اسے تھپڑ کیوں مارا؟ اس نے اس کے جسم کو ہاتھ ہی تو لگایا تھا اور پھر اس کے لئے اس نے ہی تو اس کا حوصلہ بڑھایا تھا بلکہ خود اس نے ایک روز اس کی مردانگی کو للکارا تھا۔

وہ دونوں ایک روز چاندنی چوک سے شام کے وقت آہستہ آہستہ باتیں کرتے گزر رہے تھے کہ اچانک کرن نے ایک مشہور Sex Clinic کے اشتہاری بورڈ کے طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔'' دہلی میں اتنے زیادہ سیکس کلنک کیوں ہے؟''

جسونت کرن کے اس غیر متوقع سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا تو کرن خود ہی بولی۔'' شاید پورے ملک کے بہ نسبت دہلی میں نامردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ...... تم بھی کسی کلنک میں کیوں نہیں جاتے؟''

طنز کے زہر میں بجھا ہوا کرن کا جملہ اس پر فالج کے طرح اثر انداز ہوا۔ اس کا وجود سن ہو گیا اور ذہن میں ایک سوال گونجنے لگا کیا وہ نامرد ہے۔ کیا اسے کسی سیکس کلنک میں علاج کروانا چاہئے۔ اس نے کرن کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور بغیر کچھ کہئے کرن کو چھوڑ کر تھری وہیلر سے گھر آ گیا۔

اسے گھر آ کر بھی سکون نہیں ملا۔ اس کے دماغ میں مسلسل ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ کیا وہ نامرد ہے......؟''

''نہیں، میں نامرد نہیں ہوں۔' وہ زور سے بڑبڑایا اور جلق کرنے لگا اس کے رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس کا دماغ سنسنا اٹھا اچانک جلق کے عمل کو نامکمل چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل ایا۔ اور رات ایک کال گرل کے یہاں گزاری۔

''مجھے کسی سیکس کلنک میں علاج کروانے کی ضرورت تو نہیں؟'' جسونت جھکتے جھکتے نظریں جھکائے اس کال گرل سے پوچھا۔

''سالا تو آدمی ہے کہ گھوڑا'' کال گرل شرارت سے جسونت کے کمر پر ایک دھول جماتے ہوئے کہا۔ ''تو نے مجھے روند کر رکھ دیا۔''

جسونت نے کسی طرح کا ردعمل دہرائے بغیر اپنا سوال پھر دہرایا اس بار کال گرل نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ ایسا کیوں پوچھ رہا ہے۔

''پلیز؟'' جسونت رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ؟''

''نہیں!'' کال گرل اس کے بے تکی سوال پر حیران تھی۔ ''تمہیں کسی سیکس کلنک میں علاج کرانے کی ضرورت نہیں... تم مکمل مرد ہو۔''

''اس پر لکھ دو'' جسونت اپنے پوچ بیگ سے ڈائری کا ایک سفید صفحہ اس کے طرف بڑھا دیا۔

''تم پاگل ہو گیا؟'' اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔

جسونت کچھ کہے بغیر ڈائری لئے اس کے سامنے اس طرح کھڑا تھا جیسے کوئی بھکاری کشکول لئے۔ کال گرل نے کچھ وقت حالات کو سمجھنے میں صرف کیا مگر جب وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی تو اس کے ڈائری میں لکھ دیا۔

''تمہیں کسی بھی سیکس کلنک کی ضرورت نہیں......تم مکمل مرد ہو۔''

جسونت نے راستے میں کئی بار ڈائری کے اس صفحہ کو اس طرح پڑھا جیسے ڈائری کا وہ معمولی صفحہ نہ ہو بلکہ اس کے مردانگی کی میرٹ سرٹیفکٹ، کریکٹر سرٹیفکٹ ہو اس کی مضبوط جسمانی صحت کی سرٹیفکٹ ہو اور بہت سی ڈگریوں کا مجموعہ ہو۔ وہ بہت خوش تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی جب اس نے دروازہ کھولا کر ن کئی سوالوں کے

ساتھ اندر داخل ہوئی مگر جسونت اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہ دے کر ڈائری کا وہ صفحہ اس کے سامنے پیش کر دیا جس پر کال گرل نے اس کی مردانگی کا اعتراف کیا تھا۔

جسونت زور سے چیختے ہوئے کہا۔ میں نامرد نہیں ہوں اور اس نے کرن کے کھلے گریبان میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ کرن ایک دم بوکھلا گئی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جسونت کو کیا ہو گیا۔ اس نے اس سے بچنے کے لئے حتی المقدور کوشش کی مگر جب ناکام رہی تو تڑاخ سے کئی طمانچے جسونت کے گالوں پر جڑ دیئے۔ جسونت کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا اور کرن تیزی سے گالیاں بکتے نکل گئی۔

جسونت بوجھل اور بھاری قدموں سے گھر آیا اور صوفے میں دھنس گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں نے چائے کے ساتھ ایک لفافہ اسے دیا۔ اس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک انٹرویو لیٹر تھا۔

''یہ انٹرویو لیٹر کرن کے پاس بھی آنا چاہئے'' وہ زیر لب بد بدایا اور ماضی کی اس حسین دنیا میں پہنچ گیا جہاں کبھی کرن اس کی زندگی اس کے گھر کو اپنے وجود سے اپنے پیار سے سنوارنے کی قسمیں کھاتی تھی۔ ایک روز جسونت لائبریری میں بیٹھا ایک سرکاری شعبے میں نوکری کے لئے اپنا درخواست لکھ رہا تھا اس وقت کرن نے کہا تھا۔

''میں بھی اس شعبے میں اسٹینو کے لئے درخواست بھیجتی ہوں۔'' اور جسونت کے گلے میں بانہیں ڈال کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میاں بیوی ایک جگہ کام کریں گے تو پیار بڑھے گا...... مجھے تم پر اور تمہیں مجھ پر کسی طرح کا کوئی شک نہ ہوگا۔''

''تم مرد ہو تمہیں پتہ نہیں جسونت۔'' اور اس کے منہ کو بیباکی سے چوم کر کہا۔ ''اس شک میں کتنا پیار چھپا ہوتا ہے۔''

جسونت گرچہ برسر روزگار تھا پھر بھی چنڈی گڑھ انٹرویو کے لئے گھر سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر اس کی پیاسی آنکھیں ہر سمت کرن کو ڈھونڈھ رہی تھی جو اس کی تاریک زندگی میں روشنی بھر دے۔ اس کی بھٹکی زندگی کو خوشیوں اور شادمانیوں کے راہ سے لگا دے۔

''انٹرویو کے لئے جا رہے ہو'' ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں زندگی کا صور پھونک دیا۔''

''..........'' جسونت کافی دیر تک خموشی سے دیکھتا رہ گیا۔ ''کیا تم بھی؟'' کرن

کے پلکوں پر ستارے لرزنے لگے'' ہاں! تم تو بینک میں اچھی نوکری کر رہے ہو...... پھر یہ انٹرویو......؟''

اور تم بھی تو ایک اچھا نرسری اسکول چلا رہی ہو...... پھر یہ انٹرویو......؟''

دونوں اپنے اپنے سوالوں کا جواب ایک دوسرے میں ڈھونڈھنے لگے۔ اچانک دونوں کو جیسے اپنا اپنا جواب مل گیا دونوں نے چنڈی گڑھ کا سفر منسوخ کردیا۔

واپسی کا فریب

آج ڈرائی ڈے تھا اس لئے اس کے قدم خود بخود دیسی شراب کے ٹھیکے کی طرف بڑھنے لگے اور جرائم پیشہ لوگوں کے اس خطرناک اڈے پر سستے لوگوں کی طرح سستی شراب پینے کے لئے اوٹ میں پڑے ہوئے لکڑی کے ایک گندے تختہ پر بیٹھ گیا۔ ماحول کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور شراب کا آڈر دے کر سگریٹ کا لفافہ اپنے پوچ بیگ سے نکالا۔ ساتھ ہی ایک اور کاغذ اس کی انگلیوں میں پھنسا آ گیا یہ ایک جیولری دوکان کی رسید تھی۔ اس کی بیوی نے تقریباً پندرہ روز قبل یہ رسید اسے تاکید کے ساتھ دی تھی کہ واپس آتے وقت وہ طلائی ہار لیتا آوے۔ جس کی ایک کڑی ٹوٹ گئی تھی۔

ولی نے رسید کو بڑے غور سے دیکھا اور زیر لب بدبدایا ''نور مجھے معاف کر دو، میں شرمندہ ہوں'' اور وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور تیز تیز ڈگ بھرنے لگا مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ اس طرح تیز چل کر بھی نور کو گھر پر نہیں پکڑ سکے گا۔ اس کے پہنچتے پہنچتے وہ پڑوس میں چابی دے کر ٹیوشن پڑھانے جا چکی ہوگی۔

اس نے اسکوٹر کیا اور مخصوص جیولری کی دوکان پر چلنے کو کہہ کر شاہ نور کے بارے میں سوچنے لگا ''وہ کیوں جان بوجھ کر اس کے جذبات کو مجروح کر رہا ہے؟ اس کا جواب تو شاید اس کے پاس بھی نہ تھا۔ مگر شاہ نور اکثر کہا کرتی تھی کہ اگر اسے شراب اور لفنگے دوست ہی

اتنے محبوب تھے تو اس سے محبت اور شادی کیوں کی تھی اور یہی بات ولی کو بہت کھلتا تھا۔ اس کے لئے اس نے نور پر کبھی ہاتھ تو نہیں اٹھائے مگر اس کے میکے والوں کو خوب برا بھلا کہہ کر اپنے دوستوں کی خوب مدح سرائی کرتا اور کہتا۔ ''میں سب کو چھوڑ کر تمہارے پلو سے بندھا نہیں رہ سکتا''۔

''میں کب کہتی ہوں آپ میرے پلو سے بندھیں رہیں۔'' وہ بڑی لاچاری سے کہتی۔ ''آپ رات گئے تک دوستوں میں شراب پیتے اور...... کبھی سوچا ہے میں آپ کے بغیر تنہائی کا وقت کیسے گزارتی ہوں۔ میرا اسکول میں پڑھانا بھی چھوڑوا دیا...... تنہائی کا زہر مجھے کیوں پلا رہے ہیں۔ یہ کس جرم کی سزا دے رہے ہیں آپ؟''

''تم اسے تنہائی کہتی ہو؟'' اس کے الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔ ''تمہارے ہی لیے ٹی وی اسٹریو، ریڈیو ٹیپ رکارڈ لا رکھے ہیں اور اب وی سی پی بھی لا رہا ہوں تمہارے لئے۔''

''مجھے یہ سب نہیں چاہئے!'' شاہ نور گڑگڑانے لگی۔ ''مجھے تم چاہئے۔ تمہارا پیار چاہئے وہی پیار جو تم شادی سے پہلے دیا کرتے تھے۔''

ولی کو یاد آنے لگا وہ شادی سے پہلے نور کو کتنا پیار کیا کرتا تھا ایک روز جب دونوں اجمل خاں پارک میں بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے اسی وقت نور نے ہرے دبیز گھاس پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ تب ولی کو اس کی گوری گوری پنڈیاں بہت اچھی لگی تھی اور وہ ایک انجانی کشش کے تحت اس نے اسے چوم لیا تھا۔ ''ارے یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے ہڑبڑا کر اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔

''کیوں مجھے گنہگار بنا رہے ہو؟''

''گنہگار نہیں نورا!'' ولی بڑے پیار سے جذباتی ہو کر کہا تھا۔ ''تمہیں اپنے پیار کا ادھار بنا رہا ہوں...... سچ نورا! میں تم کو بے حد پیار کرتا ہوں۔ تم واقعی میری زندگی میں ایک نور بن کر آئی اور میری تاریک زندگی کو منور کر دیا...... تم شاہ نور ہو!

''کیوں بنا رہے ہو مجھے'' وہ دلبرانہ انداز میں بولی۔

''اچھا یہ بتاؤ۔'' ولی ذرا شرارت پر اتر آیا۔ تمہارا نام شاہ نور کس نے رکھا؟''

''میرے پاپا اور کون؟'' وہ چہک کر بولی۔ دراصل میرا نام رکنی رکھا گیا تھا مگر میری پیدائش کے وقت ہی پاپا کو الکٹرک بورڈ میں افسری کی نوکری مل گئی اور پھر انہوں نے مجھے

شاہ نور کہا اور میں شاہ نور بن گئی۔''

''اگر میں تمہارا پاپا ہوتا تو تمہارا نام شاہ حسن رکھتا'' وہ ایک دلنواز مسکراہٹ سے بولا۔

''وِل تم میری ممی کو گالی دے رہے ہو''۔ اور نور نے اس کا کان پکڑلیا۔

''میری ممی بھی ایسی ہی میرا کان پکڑا کرتی ہے۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''وِل! اس بار تم نے مجھے گالی دی۔'' شاہ نور ناراضگی سے بولی ''میں تمہاری ممی ہوں کیا؟''

''نہیں نور! اس بار میں نے اپنے پاپا کو گالی دی۔'' اور وہ زور سے ہنس پڑا۔

وہ تیزی سے اسکوٹر سے اترا جیولری کی دوکان سے ہار لیا اور دوبارہ اسکوٹر میں سوار ہو گیا۔

وِل گھر پہنچا۔ فلیٹ میں تالا لگا دیکھ کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پڑوس سے چابی لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہیں اسے ایک جھٹکا سا لگا اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ کمرے کی حالت ایسی تھی جیسے وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی ہو۔ ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی کتابیں بھی۔ وہ ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا تب ہی اس کی نگاہ رائٹنگ پیڈ پر پڑی۔ لکھا تھا'' جا رہی ہوں، اب کبھی نہیں آؤں گی تمہارے دوستوں کے درمیان دیوار نہیں بنوں گی، خوش رہو...... دو برسوں کے دکھ یاد رکھوں گی۔''

دو برسوں کی ازدواجی زندگی کی اس طرح خاتمہ پر اسے پہلے تو کافی کوفت ہوئی مگر ہر طرح سے خود کو ہی مجرم پا کر کسی قدر مطمئن ہو رہا اور بکھرے ہوئے سامان کو ایک نئے عزم کے ساتھ یکجا کرنے لگا۔ اسی وقت اس کے ہاتھ البم لگا جس میں دونوں کے، کافی تصاویر تھیں۔ شاہ نور نے اپنے تمام تصویروں کو کاٹ کر الگ کر لیا تھا۔ وِل گھر کے علاوہ ان تصویروں میں بھی اب تنہا رہ گیا تھا۔ اسے زبردست ذہنی شاک لگا وہ لڑکھڑا سا گیا۔ اس کی زندگی تاریکیوں میں گم ہونے لگی۔

دفتر کے بڑے بڑے افسران سے لے کر دربان تک وِل کی اس اچانک تبدیلی پر حیران تھے مگر وہ کسی سے کچھ نہ کہتا اور سیدھے دفتر سے گھر آ کر اس بیڈ روم میں بند ہو جاتا جس میں نور اپنے پیار کا معصوم اور پاکیزہ نور برسایا کرتی تھی۔ اسے رہ رہ کر نور کا روشن اور خوبصورت چہرہ اندھیروں کے اسکرین پر ابھرتا نظر آتا مگر وہ جیسے ہی اسے چھونے کی کوشش

کرتا غائب ہو جاتی۔

''نور، اب لوٹ آؤ اپنے ول کو معاف کردو۔ میں نے اپنے تمام دوست اور شراب چھوڑ دیئے ہیں۔ تمہیں اب کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے تنہائیوں کا کرب جان لیا ہے نور......نور'' وہ بڑبڑاتے پاگلوں کی طرح فرش پر پڑا رہا۔

ایک شام جب وہ اپنی تنہائیوں سے نجات پانے کے لئے دستوئسکی کا کرائم اینڈ پنشمنٹ پڑھ رہا تھا کال بیل کی آواز آئی۔ اس نے بوجھل قدموں سے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ دروازے پر نور کھڑی تھی وہ ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ نور ایک طرف سے اندر داخل ہوگئی ول بھی بیڈروم تک پیچھے آیا اور کواڑ سے لگ کر اسے دیکھنے لگا۔

لیکن یہ اس کی نظروں کا دھوکا تھا!۔

موسم بہار کا آخری پھول

میں جس عہدے پر تعینات ہوں اور جس حساس جگہ پر مقرر ہوں مجھے ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھنا ہی پڑتا ہے اور یہ میرے عہدے کی پہلی شرط بھی ہے۔ گذشتہ چار روز سے میری نگاہ اس جواں سال خوبصورت لڑکے پر تھی جو سرحد پر دعائیہ کلمہ کے وقت اتنی اونچی آواز میں ''آمین'' کہتا کہ جیسے وہ اپنے دل کی کیفیت ''آمین'' جیسے مختصر لفظ کے ذریعہ قدرت تک پہنچانا چاہ رہا ہو۔ اس کے آمین کہنے کا انداز کچھ اس قدر متاثر کن ہوتا کہ میرا دل اس کے آمین کہنے پر آمین کہہ اٹھتا۔ کاش......! قدرت کبھی ہماری دعا بھی قبول کر لے اور دونوں ملکوں کی سرحدیں دونوں ملکوں کے لوگوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھل جائیں!

ہندو پاک کی سرحد اٹاری اور واگہہ چوکی پر ہر روز شام کے وقت قومی پرچم اتارنے کی تقریب ایک دلفریب تہوار جیسی ہوتی ہے۔ ایک طرف بارڈر سیکورٹی فورس کے جوان بینڈ باجے کی مدھر دھنوں پر قومی ترانہ بجاتے ہوئے ترنگا اتارتے ہیں تو دوسری طرف پاکستانی رینجر کے جوان پاکستان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد کی سامعہ نواز دھن پر چاند تاروں والا سبز قومی پرچم اتارتے ہیں۔ اس وقت دونوں ملکوں کے لوگ خطہ ناکس پر خاردار تاروں کے اس پار اور اُس پار ہاتھ بڑھا کر چھو لینے کے فاصلے پر روبرو خاموش کھڑے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے دلوں میں جھانکتے ہیں اور بے لوث محبت پاتے

ہیں، جسے چھو کر محسوس کرنا چاہتے ہیں، جسے چھو کر محبت کا اقرار کرنا چاہتے ہیں۔ اظہار کرنا چاہتے ہیں اور روز کوئی نہ کوئی ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ مگر فوجوں کی کڑک دار 'ہالٹ' سن کر سہم جاتے ہیں اور پھر دل سے دعا نکلتی ہے۔ ''یارب یہ سرحدوں کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھل جائیں!''

اور پھر دونوں طرف سے آمین کی صدا گونج اٹھتی ہے۔ جیسے ایک دل کی اتنی ساری آواز صرف ایک لفظ آمین میں ہو۔ یہ منظر بڑا پاک اور روح پرور ہوتا ہے۔

میں نے اس نوجوان کو دیکھا کہ کوئی چیز ہاتھ بڑھا کر پاکستان کی طرف کھڑے ایک شخص کو دے رہا ہے اور باتیں کر رہا ہے۔ میں سرعت سے اس کی طرف لپکا اور اسے گھسیٹتا گالیاں دیتا ٹھوکریں مارتا ہوا انویسٹی گیشن روم میں لے آیا۔

اس کے ہاتھ سے جو چیز برآمد ہوئی وہ تھی ایک چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر اردو میں تحریر محبت نامہ تھا۔ یہ گاؤں میں رہنے والی لڑکی شنو کے نام تھا۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ اس کے کہنے کے مطابق گزشتہ چار روز سے پرچم اتارنے کی تقریب میں شریک ہو رہا ہے۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق کیوں نہیں آرہی ہے؟ آخر کیا مجبوری ہے؟ کیا اس کی طبیعت خراب ہے یا اس کے آنے کی خبر اسے خط سے نہیں ملی۔ وہ اس کی فرمائش کے مطابق دل والے دلہنیا لے جائیں گے، کی ویڈیو کیسٹ بھی لایا ہے اور چھوٹا سا تاج محل بھی وغیرہ وغیرہ......

سختی سے پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا کہ وہ نوجوان دہلی کا رہنے والا ہے اور نام خالد انجم ہے۔ خالد انجم اور شنو کی پہلی ملاقات ایک سال قبل اجمیر شریف میں خواجہ غریب نوازؒ کے عرس کے موقع پر براق منزل ہوٹل میں ہوئی تھی۔ دونوں کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ بس دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور زکام کی طرح محبت ہوگئی...... محبت جو اقرار چاہتی ہے، اظہار چاہتی ہے، قربت چاہتی ہے۔ وہ خطوں سے ہی محبت کا اقرار کر رہے تھے، اظہار کر رہے تھے، مگر قربت تو قریب ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

تحقیق سے جب میں پوری طرح مطمئن ہو گیا تو اس کے تمام خطوط اسے واپس دے کر تاکید کی کہ وہ چپ چاپ دہلی واپس چلا جائے۔ یہاں پر ایسی ویسی احمقانہ حرکت کر کے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالے۔

''مجھے جانے کے لئے مت کہئے سر!'' خالد انجم نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ''شنو میری جان ہے! میری زندگی ہے اور میری شنو اس طرف پاکستان میں ہے مجھے اس طرف جانے دیجئے، مجھے شنو سے مل جانے دیجئے......''

''پاگل مت بنو!'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ادھر جانے کی کوشش کی تو مار دیئے جاؤ گے۔''

''کیا مجھے آپ زندہ سمجھتے ہیں سر؟'' اس نے آہ بھر کر کہا۔ ''میری روح شنو ہے، میری زندگی شنو ہے اور اس طرف ہے...... مجھے جانے دیجئے، اگر پاکستانی فوجیوں نے مجھے مار بھی دیا تو کیا غم۔ مجھے شنو کی بستی کے قبرستان میں تو جگہ مل رہی جائے گی۔ یہی مارے لئے بہت ہوگا کہ میں شنو کے قریب ہوں گا۔

اس کی باتوں سے میرا دل بھر آیا۔ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اچھے بھلے انسان کو پاگل بنا دیتی ہے۔ انجم پاگل ہی تو تھا کہ میری گھنٹوں کی پند و نصیحت اس پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ آخر مجھے سختی سے پیش آنا پڑا اور دو تھپڑ ایسے رسید کئے کہ دور جا گرا۔ اس کی متاع زندگی جو شنو کے محبت نامے کی صورت میں تھی ادھر اُدھر بکھر گئی۔ وہ جلدی جلدی اسے سمیٹنے لگا۔ میں نے اسے زور سے ڈانٹا اور ایک سپاہی کو آواز دے کر بلایا اور اسے حکم دیا کہ اس نوجوان کو امرتسر جانے والی کسی بس میں بیٹھا آئے۔''

انجم بجھے قدموں سے میری طرف شاید نفرت سے دیکھتا ہوا انویسٹی گیشن روم سے باہر نکل گیا۔ مجھے اپنے اس سلوک پر اور اس کی محبت کی کم بختی پر بڑا افسوس ہوا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اپنے ایک شہری کو دشمن کی گولیوں کا نشانہ بننے کیوں دیتا؟ میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر کمرے میں بکھرے ان محبت ناموں میں سے ایک پر جا ٹکی جسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ خط میری تفتیش میں آنے سے رہ گیا تھا......اور واقعی وہ رہ گیا تھا، وہ شنو کے ہاتھوں لکھا محبت نامہ نہیں تھا بلکہ خالد انجم کے دل کی آواز تھی...... بھائی کے نام بھائی کا پیغام تھا۔

میرے دل کی سرحدیں

اے دوست!

ملتی ہیں تیرے دل کی سرحدوں سے!!

پھر ہم
بیزار سے کیوں؟
خطاوار سے کیوں؟
شرمسار سے کیوں؟
اغیار سے کیوں؟
آؤ مل بیٹھیں
بھول کر رنجشیں تمام
اور ایک معاہدہ کریں
خاردار تاروں کو لپیٹ کر
ایک فصیل تعمیر کریں
محبت کی!
اخوت کی!!
انسانیت!!
جو بلند نہ ہو دیوار چین کی طرح
بلکہ اتنا ہو کہ
جب تم گھبراؤ
جب ہم گھبرائیں
میرے پاس تم آؤ
تمہارے پاس ہم جائیں
آؤ مل بیٹھیں
بھول کر رنجشیں تمام

مجھے یہ میرے دل کی آواز لگی اور مجھے یہ شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ پیغام ان پاکستانیوں تک ضرور پہنچنا چاہئے جو ہر وقت ہم ہندستانیوں سے لڑنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں۔ مذہب کے نام پر یہاں کے مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں مگر اتنے تنگ دل کہ یہاں کے ایک مسلمان کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔

میں نے ایک سپاہی کو بس اڈہ بھیج کر خالد انجم کو واپس بلوایا۔ شبو کے تمام خطوط اسے واپس دیئے۔ اور یہ پیغام میں نے اس کی اوپر کی جیب میں خود رکھ دیا۔ ور کہا۔ ''جاؤ اپنی شنو سے مل آؤ۔''

میں جانتا ہوں وہ کبھی واپس نہیں آئے گا نہ زندہ نہ مردہ۔ مگر انجام سے بیگانہ میری اجازت پا کر بہار کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ میرا شکریہ بھی ادا کرنا بھول گیا۔ وہ تیزی سے خاردار تاروں کی طرف بڑھا اور اندھیرے میں گم ہوتا چلا گیا۔

بابو

میں اس شہر کا مشہور و معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر ہوں۔ میرے پاس روز ہی ذہنی مریض آتے ہیں، ان مریضوں میں اکثر دولت منداور ذہنی مریض سے زیادہ وہمی مریض ہوتے ہیں، لیکن اس وقت میرے زیر علاج ایک مریضہ روپسی نام کی ہے۔ واقعی وہ روپسی ہی ہے یقیناً قدرت نے اسے فرصت میں ہی محنت سے تخلیق کیا ہوگا۔ اس کا شوہر بتا تا ہے کہ بیماری سے پہلے وہ اور بھی خوبصورت اور بلا کی چنچل اور چلبلی تھی، مگر اپنے پاپا کی موت کے بعد تو وہ بالکل مرجھا کر رہ گئی، بت کی طرح خاموش ہوگئی مگر اب کبھی اس کے ہونٹ ہلتے بھی ہیں تو یہی آواز نکلتی ہے۔ ''بابو! میں نے تمہیں معاف کر دیا!!'' اور پھر رونے لگتی ہے۔ اکثر رات کو بھی سوتے سوتے یہی جملہ دہراتی ہے۔

اس کے ذہن پر اس کی پاپا کی موت کا صدمہ زبردست ہوا ہے اس کا احساس تو مجھے خوب ہے کیونکہ یہ اکلوتی بن ماں کی اولاد تھی، جس کی باپ نے بڑے جتن سے پرورش کی اس کے بچپن کو لمبی عمر دی۔ اس کی ہر خواہش کو چشم زدن میں پورا کیا، اس کے ہر خواب کو خوبصورت تعبیر دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب!'' اس کا شوہر نے یہ سب بتاتے بتاتے مجھے خصوصی طور پر متوجہ کیا اور بولا۔ ''مگر ڈاکٹر صاحب! یہ بابو کون ہے؟ بابو نے کیا کیا جسے وہ معاف کر رہی ہے؟ بابو کے متعلق آپ پتا کریں بابو کون ہے......؟ ورنہ اگر یہ صحت مند ہو بھی گئی تو میرا

دل، میرا اعتماد اس کے تئیں صحت مند نہیں رہ سکے گا۔''

آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں نے اس کے شوہر کو تسلی دی اور کہا کہ یہ صحت مند بھی ہو جائے گی اور بابو کا راز بھی معلوم کر لوں گا...... مگر آپ مجھے اجازت دیں کہ روپسی کے علاج کے لئے آپ کی غیر موجودگی میں بھی آپ کے گھر جاؤں یا اسے اپنے پاس بلاؤں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' روپسی کے شوہر نے جلدی سے کہا۔

روپسی اب مجھ سے کسی حد تک گھل مل گئی تھی۔ جب میں اس کے گھر جاتا تو میرے لئے چائے بناتی کبھی کبھی کھانے کے لئے بھی کچھ بنالاتی۔ گفتگو کا سلسلہ تو میں ہی شروع کرتا مگر میری کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ بولے تاکہ میں اس کے کسی جملہ یا لفظ سے بابو کا سراغ پا سکوں۔

وہ بولتی بھی خوب تھی مگر صرف اور صرف اپنے پاپا کے بارے میں، میرے پاپا ایسے تھے، پاپا ویسے تھے...... پاپا مجھ سے صرف انیس (۱۹) سال بڑے تھے وہ ہینڈسم تھے۔ میری سہیلیاں بڑی مشکل سے مانتیں کہ وہ میرے پاپا ہیں۔ یوگا اور ورزش سے ان کی عمر کم سے کم دس سال کم لگتی تھی۔ میری ایک سہیلی تو انہیں میرا بڑا بھائی سمجھتی اور محبت کر بیٹھی تھی، محبت نامے لکھنے لگی تھی۔ پاپا کی طرف سے میں خود اس کا جواب لکھ کر اسے دے دیتی اور خوب لطف اندوز ہوتی...... ایک روز میں نے یہ سارے محبت نامے پاپا کو دیئے تو وہ خوب ہنسے اور ہنستے ہنستے رونے لگے۔

میں نے دیکھا روپسی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر اس کے ہونٹ لگاتار اپنے پاپا کی باتیں کہے جا رہے تھے۔ میں چاہ بھی یہی رہا تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے اور ساتھ ہی بابو کا راز بھی۔ دوسرے ہی پل بابو کا راز بھی عیاں ہو گیا، یعنی روپسی کا پاپا...... جب اسے پاپا پر بہت پیار آتا تو بابو کہنے لگتی۔

''میں اچھی طرح جانتی تھی کہ بابو اسی وقت روتے ہیں جب انہیں میری ممی کی یاد آجاتی ہے۔'' روپسی نے کہا۔

''بابو! ان خطوں کو دیکھ کر ممی کی یاد کیوں آ گئی؟''

میرے بابو الماری تک گئے اور سیف سے ایک بنڈل نکال لائے اور کہا کہ یہ تمہاری ممی کے لکھے ہوئے محبت نامے ہیں جو شادی سے پہلے مجھے لکھے تھے اور شادی کے

بعد مجھے دیئے۔

میں نے چند خطوط پڑھے۔ ایک ایک خط محبت کا امین تھا ایک ایک جملہ محبت کی چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''بابو! کیا آپ کو ممی بہت پیار کرتی تھیں؟''

''بہت!'' بابو آنکھیں بند کر کے تصور میں کھو سے گئے۔

''اور آپ؟''

''بہت زیادہ!!!'' ان کی آواز دل کی عمیق گہرائیوں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اور مجھ سے آپ کتنا پیار کرتے ہیں؟'' میں نے شوخی سے پوچھا۔

''بہت، بہت زیادہ!'' وہ جھک کر بولے اور میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں بھر کر میری پیشانی اور آنکھوں کو لطیف سا بوسہ دیا۔

''بابو!'' مجھ سے اتنا پیار مت کرو۔'' میری آواز بھرا گئی۔ ''میں تو ایک نہ ایک دن آپ کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی، پھر آپ کیا کریں گے؟''

''دنیا کی ساری بیٹیاں ایک نہ ایک دن اپنے بابل کا گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔'' وہ سنجیدہ ہو گئے اور مجھے گلے لگا لیا۔ میں تمہیں یاد کر کے بہت روؤں گا......اور میں نے سوچ لیا تمہارے جانے کے بعد تمہاری یاد میں ایک کتاب تخلیق کروں گا......خدمت خلق کروں گا۔ روپسی نام سے ایک نرسری کھولوں گا۔ لوگوں کو ماحولیات کی تعلیم دوں گا۔ پولوشن سے آزاد سماج تعمیر کروں گا۔ نوجوانوں کو پیڑ پودے لگانے کی ترغیب دوں گا کہ وہ شادی کے وقت دو پودے لگاتیں اور ہر بچے کی پیدائش پر ایک ایک پودا لگاتیں۔''

''بہت خوبصورت خیال ہے بابو! واقعی آپ جینیس پاپا ہیں......! مگر بابو؟ آپ ایسا کر کے خود کو فریب ہی دیں گے، بابو، آپ شادی کر لینا۔ آپ کی عمر ہی کیا ہے صرف اڑتیس سال۔''

روپسی نے مجھ سے کہا کہ کل میں اس کے ساتھ اس کے پاپا کے گھر چلوں وہاں وہ مجھے اور بہت سی باتیں بتائے گی۔ میں نے فوراً رضامندی دیدی کیونکہ بابو کے متعلق تو میں جان چکا تھا مگر ابھی یہ جاننا باقی تھی کہ بابو نے روپسی کے ساتھ کیا کیا تھا جس کے لئے وہ اسے معافی دے رہی تھی۔

روپسی کو دیکھتے ہی بنگلے کا گارڈ خوشی سے چیخ پڑا۔ ''بے بی آ گئی، بے بی آ گئی۔'' اور پھر پر جوش سلامی دے کر دریافت کیا۔ ''آپ یہاں رہنے کے لئے آئی ہونا بے بی''

''جلد ہی آؤں گی۔'' روپسی تیز تیز ڈگ بھرتی ہوئی صدر دروازے کو دو چابیوں سے کھول کر اندر داخل ہوئی اور سارے سوئچ آن کر کے بڑے ہال نما ڈرائنگ روم کو روشنیوں سے بھر دیا اور پھر آہستہ آہستہ آنجہانی والدین کی تصویر کے پاس گئی ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور آنسوؤں کی گلہائے عقیدت پیش کر کے لطیف سا بوسہ دیا...... بنگلے کے کمروں سے متعارف کراتے ہوئے اس بڑے سے کمرے میں لے گئی جو روپسی اور اس کے پاپا کا مشترکہ بیڈ روم تھا۔

''میں بچپن سے بابو کے ساتھ اسی بستر پر سوتی رہی۔'' روپسی نے نہایت ہی خوبصورت اور بڑے سے گول دائرہ نما بیڈ کی طرف اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ چل کر اس پر بیٹھ گئی اور ایک سوئچ آن کیا، دائرہ نما بستر گھڑی کی چھوٹی سوئی کی رفتار میں گھومنے لگے۔ اس نے بستر پر ہاتھ پھیر کر شاید اپنے پاپا کا لمس محسوس کرنے کی کوشش کی...... ''لیکن؟''

لیکن کیا؟ میں نے بلا تاخیر ''لیکن'' کو پکڑ لیا۔

''لیکن......'' وہ ٹھہر کر بولی۔ ''بابو نے ایک روز میرا بستر دوسرے کمرہ میں لگوا دیا۔''

''کیوں؟'' میرے ذہن میں ہلچل سی ہوئی مگر میں نے جواب کے لئے روپسی پر زور نہیں ڈالا اور نا ہی روپسی نے میرے ''کیوں'' کو اہمیت دی اور مجھے اپنے پاپا کی لائبریری روم میں لے آئی۔ وہاں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اقبال سے لے کر ٹیگور تک، خلیل جبران سے لے کر تلسی داس تک، پشکن سے لے کر اظہار اثر تک اور میں حیران اس وقت ہو گیا جب دیکھا کہ روپسی سے وابستہ اس کے انوپم بھی موجود تھے۔

''یہ میرے بابو کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔'' روپسی نے فخر سے کہا۔

انوپم کا یہ افسانوی مجموعہ ''روپسی'' واقعہ بہت خوبصورت تھا۔ دونوں روپسی دیکھنے اور پڑھنے کے لائق ہیں۔

پھر وہ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے آئی جہاں بے شمار تصاویر اور قیمتی کیمرے تھے۔ اس کے بارے میں روپسی نے بتایا کہ یہ اس کے بابو کا اسٹوڈیو ہے۔ وہ مجھے باٹا شوز کمپنی کی ایک اشتہاری تصویر کے پاس لے گئی اور اس نے بتایا کہ یہ چھوٹی سی بچی جو بڑا سا

جوتا پہنتے ہوئے ہے۔ وہ خود ہے۔ اس کے پاپا نے ہی تصویر کھینچی اور باٹا والوں کو دی۔ میری نظر پھر تاج محل کی ایک بڑی سی تصویر پر ٹک گئی۔ جس کے نیچے لکھا تھا۔ ''تاج محل...... ! محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو ہے جو وقت کے رخسار پر جم کر رہ گیا ہے۔''

تاج کے بغل میں ایک بہت ہی خوبصورت تصویر روپسی کی تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔ ''روپسی ...... ! میرے جبت کا جیتا جاگتا قدرت کا حسین شاہکار جسے دیکھ کر زمانہ تھم جائے، وقت کا دل دھڑکنا بھول جائے۔''

''کیا میں واقعی اتنی ہی خوبصورت ہوں جتنا کہ بابو مجھے سمجھتے تھے؟'' روپسی نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

میں نے روپسی کا سراپا جائزہ لیا۔ واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔

''واقعی تم انوپم کی انوپم روپسی ہوا!'' اور میں نے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ میرے علاج سے اس کی خوبصورتی اور صحت میں کافی فرق پڑ گیا تھا۔

وہ میرے اس ریمارک سے پھول کی طرح کھل اٹھی۔ میں نے اسے اس طرح خوش دیکھ کر ایک سوال کر دیا۔

''روپ...... ! مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ تم اپنے پاپا کو بہت پیار کرتی تھیں اور اب جب کہ وہ نہیں ہیں پھر بھی پیار کرتی ہو۔ مگر تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے پاپا نے خودکشی کیوں کی تھی؟''

ماحول اچانک سوگوار ہو گیا اور روپسی کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی نمایاں ہو گئی۔ ایک دراز خاموشی کے بعد میرے کانوں میں ایک دھماکہ ہوا۔ ''اس کی ذمہ دار میں تھی۔''

''ت...... ت...... تم؟'' میں حیرت سے ہکلا گیا۔

''ہاں...... پاپا اور میں۔'' روپسی نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم دونوں صرف باپ بیٹی ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہترین سمجھدار ہمدرد دوست بھی تھے۔ ہم دونوں کی خوشی غم، تکلیف پریشانی کا احساس ہم دونوں کو فوری ہو جاتا تھا۔ ایک روز میں نے محسوس کیا کہ بابو کچھ زیادہ پریشان ہیں اور سر کو تھامے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر ان کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور ان کی ویران آنکھیں دیکھ کر میں گھبرا

سی گئی۔ میں نے کبھی بھی اس سے قبل ان کی آنکھوں میں ان کے دل کی ویران اور درد کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بابو کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر ایک بچے کی طرح پیار کرنے لگی۔ کئی بار جھک جھک کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ وہ سکون سے آنکھیں بند کیے رہے۔ وہ کافی دیر تک آنکھیں بند کئے رہے تو میں نے سمجھا کہ شاید وہ سو گئے۔ جیسے ہی میں ان کے سر کو اپنی گود سے تکیہ پر رکھنا چاہا۔ انہوں نے مجھے دبوچ لیا...... بابو اچانک پاپا سے مرد بن گئے تھے۔ وہ مجھ پر چھا جانے لگے مگر میں کسی طرح وہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئی...... پھر بابو خوب روئے! خوب روئے! وہ خوب روئے اور ہر وقت مجھ سے معافی مانگتے رہتے۔ اسی روز انہوں نے میرا بستر الگ کر دیا اور جھٹ پٹ میری شادی کرادی۔ اس سانحہ کے بعد میں جتنے روز اس گھر میں رہی بابو مجھ سے معافی مانگتے رہے۔ میں نے دل سے انہیں اسی روز معاف کر دیا تھا مگر زبان سے اس کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ کہیں پاپا کے اندر کا مرد پھر سے مضبوط ہو کر ظاہر نہ ہو جائے۔

میرے بابو بہت نیک تھے۔ بہت ہی اچھے تھے، اس روز تو بس یونہی شیطان نے ...... میں نے انہیں دل سے معاف کر دیا ہے۔ آپ گواہ رہنا میں نے بابو کو معاف کر دیا ہے۔'' اور اس نے بابو کی تصویر کو پرنم آنکھوں سے ایک لطیف سا بوسہ دیا اور پھر میرے سینے سے لگ کر وہ خوب روئی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر۔ یقیناً اس کا دل ہلکا ہو گیا ہو گا مگر میرا دل بہت بھاری ہو گیا کہ میں بابو کے بارے میں روپسی کے شوہر کو کیسے بتاؤں گا اور کیا بتاؤں گا؟

چھڑی اور آسمان

دس برسوں کے بعد خوشی اس گھر میں شاداب کی صورت میں آئی تھی لیکن ابھی چھ ماہ کا ہی ہوا تھا کہ پولیو نے اس گھر کی تمام خوشیوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ ننھا سا خوبصورت گول مٹول سا شاداب جسے دیکھ کر گھر باہر کا چہرہ کھل اٹھتا تھا، اب شاداب سب کے لئے باعث افسردگی بن گیا تھا۔ پولیو نے شاداب کے کمر سے نیچے تمام جسم کو بے کار کر کے رکھ دیا تھا۔

اس گھر میں اب پھر وہ سب کچھ شروع ہو گیا جو اس کی پیدائش کے لئے پیدائش سے قبل بھی ہونا نہیں چاہئے تھا۔ روبینہ نے صاف اور سنجیدہ لفظوں میں وہ ٹونکا کرنے سے انکار کر دیا تھا جسے کرنے کے لئے اس کا شوہر عارف اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔

''چاہے میں عمر بھر بے اولاد رہ جاؤں، چاہے آپ دوسری شادی کر لیں، مگر میں اس سادھو کی بات ہر گز ہر گز نہیں مانوں گی......! روبینہ غصہ اور نفرت سے تلملانے لگی۔

''اس میں ہرج ہی کیا ہے روبینہ؟'' عارف نے نہایت ہی بے چارگی سے کہا......'' لوگ اولاد کے لئے کیا نہیں کرتے۔ گلی کوچے کے اینٹ پتھر تک پوجتے ہیں۔ تمہیں تو صرف اتنا کہا جا رہا ہے تین سوموار پو پھٹے نہا دھو کر گیلے کپڑوں میں شولنگ پر جل چڑھاؤ اور ...... یہ سب کرتے وقت کون دیکھے گا؟''

''اللہ دیکھے گا!'' روبینہ نے چیختے ہوئے کہا۔
''تم نے جہالت کی حد کر دی''
''کیسے مسلمان ہیں آپ؟ بچہ پیدا نہ ہونے کی ذمہ دار کیا میں ہی اکیلی ہوں؟ آپ اپنا علاج کیوں نہیں کراتے......؟''

اس سے آگے عارف کچھ نہ سن سکا مگر ڈاکٹر نے اسے جو کچھ بتایا اس پر سختی سے عمل کیا اور اس عمل کی صورت میں شاداب اس گھر میں بے پناہ خوشیاں لے کر آیا۔ گھر کے ہر فرد کے چہرے پر شادابی نمایاں تھی۔ خاص طور پر عارف کے بزرگ والدین تو بے انتہا خوش تھے۔

عارف جب بھی شاداب کو دیکھتا تو اسے وہ بھکاری یاد آجاتا جس کا وجود کمر سے نیچے تک فالج زدہ تھا۔ وہ اپنے بے جان پیروں کو ایک ٹائر کے ٹکڑے پر سمیٹ کر باندھے رکھتا اور دونوں ہاتھوں میں کھڑاؤں پہن کر ہاتھوں پر وزن دے کر کمر کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھتا۔ ساتھ ہی کٹورے کو بھی آگے دھکیلتا۔ لوگ ترس کھا کر کچھ پیسے اس کٹورے میں ڈال دیتے۔

عارف نے شاداب کا ایک پاؤں ہاتھ میں لے کر دیکھا جو اسے بالکل ٹھنڈا اور بے جان لگا۔ اس نے یکلخت سوچا۔ کیوں نہ اس کے وجود کو بے جان کر دوں؟ اور اس کے ہاتھ شاداب کی گردن تک پہنچ گئے۔

شاداب اپنے باپ کو قریب اور اس کے لمس کو شفقت سمجھ کر خوش ہونے لگا۔ اس کے چہرہ پر معصوم اور پاکیزہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ عارف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

تب ہی عارف کا باپ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔
''ناامید نہ ہو۔'' اس نے پر امید لہجہ میں کہا۔ ''دیکھنا، ایک دن یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا......اور اب تو شاداب بیٹھنے بھی لگا ہے۔ ہم اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں اور پھر اس وقت دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک علاج موجود ہیں۔''

عارف کو اپنے باپ کی بات پر ذرا یقین نہیں رہا اور ہوتا بھی کیسے؟ اس نے بے شمار پولیو زدہ امیر سے امیر کے بچوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے گھسٹتے دیکھا تھا مگر اپنے گھر میں دیکھنا قطعی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے اپنے ارادے سے روبینہ کو آگاہ کیا تو اس نے معصوم و معذور شاداب کو اپنے آنچل میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور جیسے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو، پہلے تو اس نے شاداب کو محبت سے اتنا چوما کہ اس کا ننھا چہرہ تھوکوں سے لتھڑا گیا اور پھر زخمی شیرنی کی طرح عارف پر حملہ آور ہو گئی اس نے ایک بھر پور طمانچہ مار کر روبینہ کو زمین پر ڈال دیا۔

روبینہ عارف کے پیروں کو پکڑ کر گڑگڑا کر رحم کی فریاد کرنے لگی۔

''...... خدا کے واسطے ایسا نہ سوچیں۔ شاداب بالکل ٹھیک ہو جائے گا اس کے پیروں میں خوب جان ہے، الیکٹرانک شاک کے وقت یہ خوب حرکت کرتا ہے۔ ورزش بھی روز کراتی ہوں، ابا اماں خوب مالش کرتے ہیں۔ ہفتہ میں دو دن کبوتر اور کچھوے کی خون کی مالش اور صبح و شام شیر اور سور کی چربی کی مالش اور سینکائی ہو جاتی ہے۔

رات کو سوتے وقت ایک چمچہ برانڈی بھی پلاتی ہوں ...... انجان پیر کی درگاہ پر منت بھی مانگ آئی ہوں۔ زمزم کا پانی بھی اسے پلا رہی ہو۔ امام باڑے پر اسے حسنؓ حسینؓ کے حوالے کر دیا ہے۔ تعزیہ کے نیچے سے گزار کر منت مانگی ہے کہ جب یہ بڑا ہو گا تو تعزیہ کو کاندھا دے گا۔ ایک سادھو کے کہنے کے مطابق ٹ موچن مندر میں ہنومان چالیسا کا پاٹھ بھی کروا رہی ہوں ......''

روبینہ بے تحاشہ ہذیانی انداز میں بولے جا رہی تھی ...... ''آپ ایسا نہ سوچیں، یہ گناہ عظیم ہے۔ یہ ہماری دس سالہ محبتوں کی خوبصورت نشانی ہے۔ اگر آپ اسے نہیں دیکھ سکتے تو نہ دیکھیں مگر اس کے ہم عمر بچوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھ کر دل رنجیدہ بھی نہ کریں۔ بھاگتے دوڑتے یہ دوسرے بچے آپ کی تکلیف کی وجہ ہیں۔

آپ بڑے بھائی کے پاس کلکتہ چلے جائیں۔ شاداب جب چلنے لگے گا۔ تب میں آپ کو بلوالوں گی۔''

روبینہ نے اس کی دکھتی رگ کو پہچان لیا تھا اور کیوں نہ پہچانتی۔ گھر کے تمام فرد تو اسی مرض میں مبتلا تھے۔ شاداب کے ہم عمر فٹ بال کھیلتے، اپنے اپنے ممی پاپا کی انگلیاں پکڑ کر روتے روتے اسکول جاتے دیکھتے تو گھر کے تمام لوگوں کے دل پر آری چل جاتی۔

ایک روز عارف نے دیکھا تھا کہ شاداب گھسٹتے گھسٹتے گھر سے باہر آگیا۔ چند بچے

شرارت کرتے ہوئے گرد و غبار ڈالنے لگے اور ایک بچہ نے تو شاداب پر پیشاب بھی کر دیا۔ شاداب اپنے دفاع میں رونے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔

عارف چار سال بعد جب کلکتہ سے گھر واپس ہوا تو اس وقت شاداب نو سال کا ہو چکا تھا۔ اور قریب کے اسکول میں پیدل چل کر پڑھنے بھی جانے لگا تھا۔

عارف اسے دیکھ کر باغ باغ ہو گیا اور سو جان سے اس پر نثار ہونے لگا۔ تشکر آمیز نگاہوں سے اپنے والدین اور اپنی بیوی روبینہ کو دیکھا۔

گھر میں اب سبھی لوگ خوش تھے۔ شاداب کے لنگڑانے پر بھی کسی کو خدا سے کوئی شکایت نہ تھی۔ بس ذرا دکھ اس وقت ہوتا جب وہ اچانک چلتے چلتے گر پڑتا۔

گرتے پڑتے شاداب نے کسی طرح گریجویشن کر لیا تھا اور اب اس کی خواہش تھی کہ اپنے بزرگ باپ اور چھوٹے بھائی کے کام میں ہاتھ بٹائے مگر عارف بضد تھا کہ شاداب اتنا پڑھے اتنا پڑھے کہ اس جیسا تعلیم یافتہ اس علاقہ میں نہ ہو۔ وہ اتنا بڑا سرکاری آفیسر بنے کہ وہ سارے لوگ جو اس کی معذوری پر مذاق اڑاتے تھے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ تب ہی اسے سکون ملے گا۔

شاداب نے خود کو اپنے والدین کی مرضی کے آگے ڈال دیا۔ عارف اس کی فرمانبرداری پر بہت خوش تھا اور ایک بہت ہی خوبصورت امپورٹیڈ چھڑی اسے دی اور تاکید کی۔

''اسے ہاتھ میں لے کر چلا کرو۔ تمہیں بہت اچھا لگے گا۔ اور گرو گے بھی نہیں۔ تم چلتے چلتے اچانک گر پڑتے ہو تو مجھ پر ہمالیہ گر پڑتا ہے!''

''ابو! میں معذور نہیں ہو۔'' شاداب کے جملے میں بلا کا درد تھا۔ مجھے اس چھڑی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے، میرا سہارا آپ ہیں، امی ہیں اور میرا چھوٹا بھائی ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے بیٹے! عارف نے درد بھرے لہجے میں شفقت سے کہا...... '' مگر اس سال محرم میں تمہیں تعزیہ کو کاندھا بھی دینا ہے۔ تمہاری ماں نے منت مانگی تھی۔''

اس سے آگے وہ اور کچھ کہتا کہ گلی سے آواز آئی...... ''جنازہ تیار ہے۔''

شاداب تیزی سے باہر نکل گیا کہ کہیں اس کا باپ چھڑی کا سہارا لے کر چلنے پر مجبور نہ کر دے۔ آخر وہ دہلیز پار کرتے وقت گر بھی گیا۔

عارف اور روبینہ نے دوڑ کر اسے اٹھایا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی تھما دی جسے وہ دھیرے سے کنارے رکھ کر آگے بڑھ گیا۔

جنازے کے پاس کوئی زیادہ بھیڑ نہیں تھی اس لئے جنازہ کو کاندھا دینے کے لئے وہ بھی کوشش کرنے لگا۔ تبھی ایک باریش بزرگ نے شاداب کو ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا اور کہا۔ ''تم سے خود اپنا بوجھ تو اٹھایا نہیں جاتا۔ اس غریب کی لاش کو گرا کر اسے کیوں جہنمی بنانا چاہتے ہو۔ جس کی لاش جنازے سے گر جائے وہ جہنمی ہو جاتا ہے۔''

پتہ نہیں اس باریش بزرگ نے یہ بات کس نظریہ سے کہی تھی۔ شاید اس کا نظریہ شاداب کو جنازے کو کاندھا دینے سے روکنا ہوگا۔ جنازہ لے کر لوگ آگے بڑھ گئے مگر شاداب وہیں کھڑا رہ گیا جیسے اس کے پیروں میں جڑ اگ آئے ہوں۔

عارف نے پیچھے سے آ کر اس کا کاندھا تھپتھپایا اور ہاتھ میں پھر چھڑی دے دی۔

شاداب کے چہرے پر دنیا جہان کا کرب نمایاں ہو گیا چھڑی ہاتھ میں لے کر اس نے پھر اپنے باپ کو واپس کرتے ہوئے کہا: ''ابو مجھے چھڑی کا سہارا لینے کے لئے مجبور نہ کریں میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔''

عارف کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے آبدیدہ نگاہوں سے خاموش فریاد کی۔

''کیوں مجھے جہنمی بنانا چاہتے ہو زندگی بھر تو تمہارے لئے صلیبوں پر ...... رہا ہوں۔ کیا مرنے کے بعد بھی جہنم بھیجنا چاہتے ہو......؟''

عارف کے دل و دماغ پر اس بزرگ کی بات نقش کر گئی کہ جس کسی کی لاش جنازے سے گر جائے وہ جہنمی ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ہر وقت رہتی کہ شاداب اس کی لاش ضرور گرا دے گا۔ اسے باپ کے جنازے کو اٹھانے سے کون روکے گا؟

وہ تصور میں خود کو جہنم میں دیکھتا۔ جہنم کے فرشتے خون اور پیپ پلاتے۔ دہکتی آگ میں ڈالتے ......سینکڑوں سانپ بچھو اسے ڈستے۔ وہ بھاگتا مگر کہیں اسے کوئی راہ نہیں ملتی۔ وہ گرجتا چیختا۔

''کیا ہوا......؟'' روبینہ نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ ''کیا کوئی برا خواب دیکھ رہے تھے؟''

''ہاں!'' عارف نے ہانپتے ہوئے کہا اور پانی مانگا۔

عارف اب اکثر دن یا رات، جب بھی سوتا، سوتے سوتے چیخنے لگتا۔ ''بچاؤ بچاؤ'' کا شور مچانے لگتا۔''

عارف کی اس ذہنی کیفیت کو کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا اور سمجھتا بھی کیسے اس نے کبھی اس باریش بزرگ کی بات کی دیتی نقطہ نگاہ سے تصدیق نہیں کرائی۔ اور نہ ہی اپنی ذہنی کیفیت کسی پر ظاہر ہونے دی۔

آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس کلکتہ چلا جائے گا۔ اور زندگی کے آخری دن وہیں گزارے گا تا کہ شاداب اس کے جنازے کو کاندھا نہ دے سکے۔ نہ اس کی لاش گرے اور نہ ہی وہ جہنمی بنے۔

عارف نے کلکتہ جانے سے پہلے شاداب کو یونیورسٹی ہاسٹل سے گھر بلایا۔ جی بھر کر اسے دیکھا، پیار کیا، بلائیں لیں اور نصیحت کی کہ وہ ہر حال میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اس کے لئے شاداب سے اس نے عہد لیا اور آخر میں اسے وہ چھڑی دی جسے اس نے ایک بار پھر ٹھکرا دیا۔

عارف زیادہ دنوں تک اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس کلکتہ نہیں رہ سکا اور چارپائی سے لگ کر گاؤں واپس آ گیا۔

روبینہ اور شاداب کی بے لوث تیمارداری نے عارف کو بے پناہ ذہنی اذیتوں کے بعد صحت کی راہ پر ڈال دیا۔ اب وہ پھر سے چلنے پھرنے لگا تھا۔ بس ذرا کمزوری تھی جس کے لئے شاداب اکثر دوائیاں قریب کے شہر سے لے آتا۔

ایک بار جب وہ دوا لانے 'گیا' گیا تو اس کی مسخ شدہ لاش واپس آئی کیونکہ شہر کے ایک مصروف سڑک پار کرتے وہ گر گیا اور ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ گیا۔

بے پناہ بھیڑ کے درمیان شاداب کا جنازہ قبرستان کی طرف روانگی کے لئے بزرگ باپ عارف کا منتظر تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے جنازہ تک آیا۔ جنازے کے اگلے حصہ کو پکڑ کر اٹھانا چاہا اور رک گیا۔

پھر وہ تیزی سے گھر کی طرف گیا اور ہاتھ میں وہی چھڑی لے کر اس نے جنازہ اٹھایا...... ایک بوجھ اس کے سینے سے اتر گیا تھا مگر دوسرا ایک بوجھ جو دونوں جہاں کے بوجھ سے بھاری تھا اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا۔

آپ کسی کو معاف نہیں کر سکتے!

اس کی انگلیوں کے درمیان قلم کافی دیر سے پھنسا ہوا تھا اور وہ رائٹنگ پیڈ پر جھکا کچھ لکھنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر وہ اب تک کچھ بھی لکھنے میں معذور اس لئے تھا کہ نسیم کے خط آنے کے بعد ہی اس کے ذہن میں ماضی کے بے شمار واقعات و حادثات یادوں کی شکل میں کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگئے تھے کہ اسے لکھنے کے لئے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا کہ خط کہاں سے اور کیسے شروع کرے۔ مگر تمیرا کی محبت کا ایک ایک منظر اب بھی اس کے ذہن میں بالکل صاف تھا۔

اس کی تھکی ماندی زندگی کی طرف جب قمر نے پہلی بار محبت اور چاہت کی نظروں سے دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے تپتے ہوئے ریگستان پر گھنگھور کالے بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش ہوگئی۔ ہر طرف ببول کی جھاڑیوں پر خوبصورت سفید پھول کھل گئے مگر اسی نسیم کی سازش نے سارے پھولوں کو لاٹھیوں سے پیٹ پیٹ کر زمین پر گرادیا اور کانٹوں کو راہوں میں بچھا دیا۔

اس نے کانٹے کی چبھن محسوس کی اور وہ بلبلا اٹھا۔ ''کمبخت میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا کہ......'' اور وہ رو پڑا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ ستارے جگمگا رہے تھے۔ مگر چاند پر اب بھی بدلی کا ایک ٹکڑا

رکا ہوا تھا۔اس نے خود کو نارمل کرنے کے لئے کاغذ کا وہ بوسیدہ ٹکڑا نکالا جو اکثر اوقات نسیم اور اس کے ہم زلف کے خلاف دل میں اٹھنے والے انتقام کے جذبے کو دبانے کے لئے یا تمیرا کی محبت کی مسرور کن لہروں کو پاش پاش کرنے کے لئے یا پھر اس کی بیوفائی کو بھول جانے کے لئے پڑھتا۔اسے یہ کاغذ کا ٹکڑا جامع مسجد کی سیڑھی پر اپنے ہی پاؤں کے نیچے دبا ملا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات جب جمیل محبت کی بازی ہار کر دل میں انتقام کا جذبہ لئے دلی کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گھوم گھوم کر سینے کا سارا خون تھوک رہا تھا۔ایک روز جان پر کھیل کر انتقام یا خودکشی کا فیصلہ کرنے کے لئے جامع مسجد کے مشرقی دروازہ پر مایوس بیٹھا ہوا تھا اچانک اسے ایسا لگا جیسے مولانا آزادؒ اپنی قبر سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئے اور ایک استاد کی طرح ایک چھڑی اسے رسید کی اور کہا۔

انداز جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

پرائی عورت سے محبت کرے گا تو عمر بھر اسی طرح ذلیل رہے گا۔ ملک وقوم سے محبت کر۔کے سرخروئی حاصل کر۔ دل سے انتقام کے جذبے کو نکال ...... اللہ صلہ رحمی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ...نا امیدی کفر ہے...... امید کی شمع روشن کر اور اجالے میں آ۔''

وہ ابھی ان باتوں کی تہہ میں اتر بھی نہ پایا تھا کہ ننگ دھڑنگ شہید سرمدؒ نظر آئے اور ۱۰۷۰ھ کے مشہور کراماتی جملے کو رد و بدل کر کے دہرایا۔'' تیرے مصیبتوں کا حل تیرے پاؤں کے نیچے۔''

جمیل نے اپنے پاؤں کو دیکھا! ایک بوسیدہ کاغذ کا ٹکڑا اس کے تلوؤں سے دبا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگا۔

''قدرت سے رشتہ جوڑنے کا مطلب ہے، زخمی دل کے لئے مرہم حاصل کرنا، نئی زندگی اور نئی جوانی پانا، جب افکار و آلام گھیر لیں۔ جب اختلافات اور شکر رنجیاں دل کو ٹکڑے ٹکڑے کردیں۔ جب اعصاب تھک جائیں اور آگے کام کرنے سے جواب دے دیں، تب قدرت کی آغوش میں پہنچ جایئے اور اس کی پیار بھری تھپکی کا اثر اور اعجاز دیکھئے جب ہمارے جسم کا رواں رواں قدرت کی نکہت بیز و نکہت بار فضا میں امرت نہاتا ہے۔ آب حیات پیتا ہے۔تب ہمارے دل کے زخم کس طرح بھر جاتے ہیں یہ ہم تجربہ کر کے ہی

جان سکتے ہیں۔''

جمیل نے اسی وقت اپنے دل سے انتقام و دشمنی کے جذبے کو نکال دیا اور قدرت سے رشتہ جوڑ کر انسانیت نواز بن گیا۔ اس کا ثبوت اس نے نومبر ۱۹۸۴ء کے ہندو سکھ فساد میں دیا ہے۔

نومبر ۸۴ کی پہلی تارن تھی دلی کی تاریخ ایک بار خود کو پھر دہرا رہی تھی۔ لوٹ مار، آتش زنی، قتل و خون ہر طرف جاری تھا۔ مگر اس بار ۱۹۴۷ء کی طرح اس کا نشانہ مسلمان نہیں تھے بلکہ اس ملک کے وفادار سکھ تھے۔ وہ باہر سڑکوں پر نکل آیا اس نے دیکھا کئی شرپسندوں نے ایک سکھ جوان کی پگڑی سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے اور قریب کھڑی کار سے پٹرول نکال کر اس پر چھڑک کر آگ لگا دی۔ وہ دہشت و وحشت کے مارے ویران سڑک پر دوڑنے لگا۔ آگ اس کی رفتار کے ساتھ تیز ہوتی گئی۔ تب وہ اچانک زمین پر لیٹ کر لڑھکنے لگا۔ آگ بجھنے لگی تب ہی کچھ لوگوں نے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔

اس کی روح لرز گئی وہ مزید اس طرح کا منظر نہیں دیکھ سکا اور وہ گھر لوٹا ہی تھا کہ اس نے ایک پر ہجوم شور سنا۔ اس نے صدر دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک سکھ نوجوان ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہانپتا کانپتا اس کے گھر میں گھس گیا اور کچھ ہی پل بعد اس کے دروازے کے سامنے سے جانوروں کی طرح بھاگتا ہوا ایک ہجوم گزر گیا۔

وہ اندر کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑے ملتجی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جمیل اس وقت ان دونوں سے کچھ پوچھنا یا کہنا بہتر نہ سمجھا صرف تسلی دے کر محفوظ جگہ پر چھپا دیا۔

رات اس سکھ نوجوان نے خود ہی بتایا کہ وہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ اس کے گھر کے سارے لوگ مار دیئے گئے ہیں۔ صرف یہی دونوں نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اس کا نام ایشر سنگھ ہے اور اس کی بہن منجیت کور۔

''ایشر سنگھ!'' جمیل زیر لب بدبدایا اسے ایسا لگا کہ یہ نام اس نے کہیں سنا یا پڑھا ضرور ہے۔ پھر اس کی نظر اس کی بہن منجیت کور کے شگفتہ چہرہ پر جم گئی۔ کتنا آشنا لگتا ہے اس کا چہرہ۔

اس کے ذہن کے آنگن میں تمیرا کا سراپا متحرک ہوگیا۔ وہی مخمور و غزالی آنکھیں، ستواں ناک، شفق پھوٹتے ہوئے بھرے بھرے رخسار، پتلے پتلے سرخ سرخ ہونٹ، کمر تک بل کھاتی گھنی ریشمی زلفیں، سڈول بانہیں، بھرے بھرے کولہے کے ابھار۔ ہرزاویہ سے منجیت کور اس کی تمیر النساء لگ رہی تھی۔ تمیرا کی محبت اچانک اس کے دل میں جاگ اٹھی اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ تمیرا کو کھو چکا ہے مگر اس کی شکل میں منجیت کور کونہیں کھوئے گا۔ وہ ایشر سنگھ کو جان سے مار کر اسے سڑک پر پھینک دے گا اور اس کی بہن کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لے گا۔

اچانک اسے یاد آیا ۱۹۴۷ء کے فساد میں سکھوں نے ہماری بے شمار خواتین کو اغوا کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ایشر سنگھ یا اسی جیسا نام کا سکھ سعادت حسین منٹو کے افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' میں ہماری برادری کی ایک مردہ خاتون کے ساتھ...... اس کے رگوں میں خون گرما گیا اور اس ایشر سنگھ کو ضرور مار دے گا۔

اس نے اپنے دل اور ارادے کو مضبوط کرنے کے لئے ۴۷ کے فساد کا ایک اور قصہ یاد کیا۔ جالندھر کے ایک گاؤں کے چالیس سالہ بوٹا سنگھ نے تو سترہ سالہ زینت کو چادر ڈال کر اپنے پاس دو سال تک رکھا۔ دو بچیاں بھی ہوئیں۔

''میں بھی منجیت کور کو رکھ لوں گا۔'' اس نے اپنے من میں سوچا۔

بوٹا سنگھ زینت کے لاہور واپس جانے کے بعد مسلمان ہوگیا۔ اس نے اپنا نام جمیل احمد رکھا اور زینت کو لینے لاہور گیا۔ مگر زینت کی بیوفائی پر اس نے جان دے دی...... سب عورتیں بے وفا ہوتی ہیں۔ تمہاری تمیر النساء بھی بیوفا ہے۔'' دل کے گوشے سے یہ آواز ابھری۔

''نہیں!'' وہ اپنے دل کی آواز پر چیخ پڑا۔ ''میری تمیرا بیوفا نہیں، وہ محکوم و مجبور تھی، وہ محکوم و مجبور ہے۔''

''منجیت کور بھی تمہارے پناہ میں محکوم و مجبور رہے گی۔'' اس کے دل سے پھر آواز آئی۔ ''تم اس کے بھائی کے قاتل ہوگئے تو وہ تم سے کیونکر وفا کرے گی؟''

جمیل نے اپنا سر تھام لیا اور اس کا ارادہ ہاں اور نہیں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح ڈولنے لگا۔ کئی روز بعد جب حالات معمولی حد تک سازگار ہوئے تو ایشر اور منجیت

نے گرودوارے میں پناہ گزیں ہونے کی بات کی تو جمیل کا چہرہ بجھ گیا۔

''مجھ سے کوئی بھول ہوگئی کیا؟'' دراصل منجیت کے آنے سے وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا گرچہ اس نے ایشر سنگھ کو جان سے مارنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا مگر اس کے دل کی چاہ بدستور تھی کہ منجیت ہمیشہ نہیں تو کچھ روز اور اس کے گھر رہے۔

''نہیں میرے بھائی۔'' ایشر سنگھ بولا۔ تو نے جان سے بھی قیمتی میری عزت بچائی تو فرشتہ ہے۔''

اسی وقت منجیت آگے بڑھی اور اپنا ڈوپٹہ جمیل کی کلائی پر راکھی کی طرح باندھ دیا۔ جمیل بہت متاثر ہوا پھر اس نے ڈوپٹے کو اس کے سر پر ڈال دیا۔ منجیت اس کے گلے لگ گئی اور تینوں رو پڑے۔

جمیل خود کو پر سکون کر چکا تھا اس نے بڑے اطمینان سے مختصر سا خط لکھا۔ ''انتقام کے جذبہ کو اپنے دل میں جگہ مت دیجئے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو آپ کے ساتھ آپ کے گھر کو بھی پھونک دے گی۔ انسان کی فطرت میں گناہ اور جرم شامل ہے۔ اس سے نفرت مت کیجئے بلکہ اس کی اصلاح کے لئے نیک راہ تعین کیجئے۔ اسے معاف کر دیجئے۔ کسی کو معاف کر دینا ایک بلند معیار عظیم انتقام ہے۔ میرے دل میں آپ کے لئے محبت ہی محبت ہے۔''

کباڑی بازار کا کوٹ

''ادب برائے زندگی''...... کتنا خوبصورت نعرہ ہے اس مختصر سے نعرے میں کتنی کشش ہے۔ اس کشش میں بندھ کر نہ جانے کتنے لوگوں نے ادب کو زندگی میں سمولیا ہوگا۔ اور نہ جانے کتنے لوگوں نے زندگی کو ہی ادب کے حوالے کر کے اپنی پوری زندگی کو اجیرن اور بے رنگ بنالیا ہوگا...... جو ادیب آج ادب اور زندگی میں واضح فرق نہیں رکھتے وہ پھر نہ تو ادب کے رہ جاتے ہیں اور نا ہی زندگی کو جینے انداز میں جیتے ہیں بلکہ زندگی اور زندگی کی تمام خواہشوں کو اپنے ہی ہاتھوں بنائی صلیب پر مصلوب کر دیتے ہیں۔

وہ مصلوب زندگی کو اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے لال قلعہ کے عقب میں صدیوں پرانی کباڑی بازار میں اپنے لئے کسی کا اترن پرانا کوٹ تلاش کر رہا تھا۔ اسے کوٹ اس لئے نہیں چاہئے تھا کہ دلی میں زبردست سردی پڑ رہی تھی۔ وہ دہلی کی کئی سرد راتیں برسوں پرانے بے روئیں والے ہاف سوئٹر میں ہی گزار چکا تھا۔ اسے کوٹ اس لئے بھی نہیں چاہئے تھا کہ اس کے پاس روپئے آ گئے ہوں اور وہ اپنی دبی کچلی خواہش کو تکمیل دینا چاہتا ہو۔ اسے تو کوٹ اس لئے چاہئے تھا کہ اردو اکیڈمی نے اپنے سالانہ پروگرام ''نئے پرانے چراغ'' کے تحت اسے افسانہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا تھا۔

خوش پوش ادباء وشعراء کو اسٹیج سے اپنی تخلیقات سامعین کے سامنے پڑھتے دیکھتا تو

اسے رشک آتا اور کچھ ادباء سے تو حسد بھی۔ جب وہ اپنی کسی تخلیق کا اس کی تخلیق سے موازنہ کرتا تو اس کی تخلیق بے وقعت ہو کر رہ جاتی۔ پھر بھی ادب میں اس کا مقام کسی شمار میں نہ ہوتا تھا۔ اس کی بھی بڑی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی کبھی خوش لباس ہو کر اسٹیج سے اپنی تخلیق لوگوں کے سامنے پڑھے اور براہ راست داد و تحسین حاصل کرے...... یوں تو ملک و بیرون ملک سے اس کے پاس بے شمار خطوط اس کی تخلیق سے متعلق تعریف میں آتے۔ مگر براہ راست داد و تحسین حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اردو اکیڈمی کا دعوت نامہ ملنے سے وہ بے حد خوش تھا۔ اس کی دیرینہ آرزو پوری ہونے والی تھی اور ساتھ ہی ادیبوں کی برادری میں شامل ہونے کی پوری امید تھی۔ اب تک اس نے درجنوں افسانے لکھے اور عوام میں مقبول رسالوں میں چھپے مگر ادیبوں نے اسے ادیب نہیں مانا کیونکہ ان رسالوں کو ادبی رسالہ ہی نہیں مانتے، ہاں کوئی کوئی ادیب ذرا فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے نیم ادبی رسالہ ضرور کہہ دیتا تھا۔

وہ کسی محفل میں ادیبوں سے بھی ملا اور جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو اسے مشورہ ضرور دیا گیا کہ ان رسالوں کے بجائے فلاں فلاں رسالوں میں چھپے۔ حالانکہ بتائے گئے تمام رسالوں وہ میں اپنی تخلیقات کئی کئی بار بھیج چکا تھا مگر ہر بار شکریہ کے ساتھ یا معذرت کے ساتھ واپس کر دیا گیا تھا۔ اس لئے اس نے ان رسالوں کو بھیجنا ہی بند کر دیا تھا۔

مگر وہ اس بار ہمت کر کے براہ راست ایک مشہور ادبی رسالہ کے دفتر میں اپنی نئی پرانی تخلیقات کا پلندہ لے کر پہنچ گیا۔ ملاقات کی سلپ بھیجنے کے کافی دیر بعد اسے ایڈیٹر نے اپنے کیبن میں بلوایا۔

''ہاں، کہیے؟'' ایڈیٹر بڑے ہی پھیکے انداز میں مخاطب ہوا۔

''جی! مجھے جمیل احمد قریشی کہتے ہیں۔'' جمیل نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''ہاں، تو؟'' ایڈیٹر اس قدر خشک مزاج ہوگا جمیل نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''میں افسانہ نگار ہوں۔'' جمیل نروس سا ہو رہا تھا۔

''ہاں، تو؟'' اور اس بار ایڈیٹر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ کے رسالے کے معیار کو مدنظر رکھ کر کچھ افسانے لایا تھا''۔ جمیل نے اپنی فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب تک کہاں کہاں چھپ چکے؟'' اور ایڈیٹر نے جمیل کو بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔

جمیل نے خوش ہو کر ایک سانس میں ملک کے کئی بے حد مقبول رسالوں کے نام گنوادیئے۔ جن کے قارئین کا حلقہ وسیع ہے۔ مگر اس کی خوشی یہ سن کر کافور ہوگئی کہ یہ سارے رسالے یا تو غیر ادبی ہیں یا نیم ادبی ہیں۔ ان میں چھپی تیقات کی کوئی وقعت نہیں وہ اس اپنے اس ردی کے پلندہ کو اس میز سے اٹھالے اور اس کا وقت برباد نہ کرے۔

مگر جمیل آج یہ مصمم ارادہ کر کے آیا تھا کہ چاہے جیسے ہو اس رسالہ کے ایڈیٹر کو اپنے کچھ افسانے کو ضرور پڑھوائے گا اور داد تحسین بھی حاصل کرے گا یا ان افسانوں کے پلندہ کو کسی گٹر میں ڈال کر اس نام نہاد ادبی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دے گا۔ جمیل کو اس کے لئے دو گھنٹہ تک انتظار کی اذیت جھیلنی پڑی۔ آخر ایڈیٹر کو رحم آ ہی گیا اور اس کے کئی افسانے سلسلہ وار پڑھ کر اس نے ان تخلیقات سے متعلق اپنی جو رائے دی اسے سن کر جمیل کی حالت یہ ہوئی جیسے آسمان میں اڑ کر پریم چند سے مل آیا ہو...... جمیل کے چہرہ کا جمال بڑھ گیا۔

''اس میں کون کون سا افسانہ آپ کے رسالے کے معیار کے مطابق ہے۔'' جمیل نے بہت خوش ہو کر دریافت کیا۔

''ہیں تو سبھی۔'' اب ایڈیٹر صاحب کافی نرم پڑ چکا تھا۔ ایک افسانہ کو اس نے فائل سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت پسند ہے!''

''یہ افسانہ آپ کو پہلے بھیج چکا ہوں جسے آپ نے معذرت کے ساتھ واپس کر دیا تھا'' جمیل نے بڑے ادب سے شکایت کی۔

''واپس تو میں اب بھی کر رہا ہوں۔'' افسانوں کی فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''مگر کیوں؟'' جمیل حیران تھا۔''

''اس لئے کہ'' اس نے رک کر جمیل کو غور سے دیکھا اور سمجھانے کے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''اس لئے کہ اس رسالے کی معیار پر اُسی کی تخلیق پوری اترتی ہے جس کا خالق اس رسالہ کا سالانہ خریدار ہوتا ہے...... اب ذرا اس افسانہ کو دیکھو۔ بکواس ہے بکواس مگر اسے چھاپنا میری مجبوری ہے کیونکہ اس کا خالق اس رسالہ کا خریدار ہے۔

تم جیسے کچھ لوگ ہی ادب کو ادب بلکہ ادب کو ہی زندگی سمجھتے ہیں اور اردو کے تئیں مخلص ہیں۔ہم ہر خریدار کی تخلیق سال میں ایک بار ہی چھاپتے ہیں، دوسری بار کے لئے الگ سے سالانہ چندہ لیتے ہیں۔تیسری بار کسی کو نہیں چھاپتے شرط ہے کہ وہ واقعی تب تک اسٹیبلش نہ کیا ہو ادب اب ادب نہیں رہا کاروبار ہو گیا ہے۔اس میں بھی پونجی کی ضرورت ہے۔آج بڑا ادیب وہی ہے۔ ں کے پاس پیسہ ہے۔پیسے کے بوتے اپنے اوپر اپنی بیہودہ تخلیقات کے اوپر مضامین لکھواتے ہیں اس پر ریسرچ کرواتے ہیں، اس طرح غریب مزدور (تخلیقی ذہن اور صلاحیت رکھنے والے قلمکار کا) بھی پیٹ کسی طرح بھر جاتا ہے اور جگنوں کی طرح ادب کی دنیا میں بھی غریب ادیبوں کا خوب خوب استحصال ہوتا ہے......ادب میں دیو بندی اور بریلوی عقیدہ جیسا گروپ بھی ہے۔ترقی پسند، جدید، مابعد جدید اور پتہ نہیں کیا کیا۔نہ سمجھ میں آنے والا گروپ ہے......تم کون سے گروپ کے ہو؟'' ایڈیٹر نے جیسے طنز کیا۔

''معلوم نہیں!'' جمیل نے بڑی معصومیت سے کہا۔'' آپ نے میرے کچھ افسانوں کو پڑھا یہ کس گروپ کے ہو سکتے ہیں۔''

''معلوم نہیں!'' اور ایڈیٹر نے زور سے قہقہ لگایا۔جمیل بھی اس کے قہقہ میں شامل ہو گیا۔

قہقہہ کے بعد مرگھٹ سی ویرانی اور خاموشی چھا گئی۔دونوں ایک دوسرے کو ناامیدی کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔جمیل نے خاموشی توڑی۔

''تو میں چلوں!!'' جمیل احمد قریشی!'' ایڈیٹر ہمدردی جتاتے ہوئے 'ولا۔'' میں بھی مجبور ہوں اور ادب کا ملازم مجبور ہی ہوتا ہے۔اس رسالہ کا پبلشر ایک کاروباری ادیب ہے۔''

جمیل جیسے ہی کیبن سے نکلنے کو ہوا اسے ایڈیٹر کی آواز نے روک لیا، اور اس سے کہا کہ وہ اپنا ایک افسانہ اور مکمل پتہ چھوڑ جائے۔اسے کہیں سے روپیہ دلوانے کی کوشش کرے گا پھر وہ اس رقم سے اس رسالہ کا خریدار بن جائے۔جمیل پوری طرح فرمابرداری کا مظاہرہ کر کے چلا گیا۔

اس نے لال قلعہ کے عقب میں کباڑی بازار کو اچھی طرح چھان مارا مگر اسے پسند کا

کوٹ نہیں ملا۔ ہاں اسے یہ جانکاری ضرور ملی کہ اچھی اچھی چیزیں منہ اندھیرے ہی بک جاتی ہیں اگر اسے خریدنا ہو تو اگلے ہفتہ صبح پانچ بجے ہی آجائے۔

منہ اندھیرے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تو گھومتے پھرتے وہ ایک بزرگ کباڑیئے کے پاس گیا جو خالی بیٹھا کسی گاہک کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے پاس آتے دیکھ کر سامان جھاڑنے پونچھنے لگا۔ جمیل بھی اس سے اچھی چیز کی جستجو کرتے ہوئے بہت سے سامان کو چھوا تو اس بزرگ کباڑیئے نے خود ہی اس سے کہا اگر اچھی چیز چاہئے تو منہ اندھیرے آیئے اس کباڑی بازار کے اندھیرے نے کتنی ہی زندگی کو اجالے دیئے ہیں۔ نہ جانے کتنے اور کیسے کیسے باعزت لوگوں کی عزت کو بچایا ہے۔'' یہ بازار صدیوں سے لگ رہا ہے پہلے اندھیرے میں ہی شروع ہو کر اندھیرے میں ہی ختم ہو جاتا تھا مگر اب یہ بازار پورے دن لگا رہتا ہے۔ مگر آج بھی اچھے اور باعزت لوگ منہ اندھیرے میں آتے ہیں...... کبھی کسی باعزت کو مجبوری کے عالم میں گھر کا اپنا ذاتی سامان بیچنا ہوتا ہے تو اس اندھیرے میں بیچ کر اپنی عزت کو کچھ دیر کے لئے اور زندہ رکھ لیتا ہے۔ یہ بازار صرف ایک بازار نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے جو آج بھی قائم ہے۔ اور اسے قائم رہنا بھی چاہئے۔ مجبوریاں ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔''

اسے ایک ڈبل برسٹ کوٹ پسند آ گیا مگر دوکاندار نے اسے بیچنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اسے ابھی کوئی بیچ گیا ہے اور وہ اپنے اصول کے مطابق اسے واشنگ پریسنگ کے بعد ہی بیچے گا مگر جمیل کے بے حد اسرار کے آگے وہ جھک گیا۔

ڈبل برسٹ کوٹ پہنتے ہی جمیل کا سینہ فخر سے گز بھر چوڑا ہو گیا۔ بڑے آرام سے ڈگ بھرتا ہوا گھر گیا۔ کوٹ گندہ تو ضرور تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ اسے پہنا نہیں جا سکے۔ اسی لئے اس نے ایک ٹیلر کی دوکان جا کر وہ کوٹ برشنگ اور پریسنگ کے لئے دے دیا کیونکہ اسے آج ہی دس بجے افسانہ پڑھنے جانا تھا۔ برشنگ کے وقت ٹیلر نے اس کے ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ اور ایک پرزہ تھما دیا۔

پوسٹ کارڈ کسی نریش کے نام تھا جس میں اسے تاکید کی گئی تھی کہ اگر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو پا رہی ہے تو چاہے جیسے ہو گھر آ جائے۔ اس کے لئے گھر میں سب پریشان ہیں......اور وہ کاغذ ایک چیسٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر کا تھا جس میں کچھ دوائیاں لکھی تھیں۔

کباڑی بازار کا وہ کوٹ اور کچھ دوائیاں نریش کو دے کر زینے سے نیچے اترتے وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ غالب اکیڈمی کے اسٹیج سے اپنا افسانہ پڑھ کر نیچے اتر رہا ہو اور سامعین پر زور تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اسے دادِ تحسین پیش کر رہے ہوں۔

اوہ کلکتہ

گذشتہ دو موقعوں کی طرح اس بار بھی پیمائش ہوئی تو پورے فلیٹ کا رقبہ سات سو پچیس مربع فٹ آیا۔ اس نے پورے فلیٹ کو ایک سرسری نظر سے دیکھ کر چاروں سمت کھلنے والی کھڑکیوں سے باہر جھانک کر اپنے فلیٹ کی اہمیت کا اندازہ لگایا۔ زیر لب کچھ بدبدایا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی ایک کرن پھوٹ پڑی۔ چہرے سے اطمینان اور سکون جھلکنے لگا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدمیوں سے گندے پلاسٹر سے بے نیاز دیوار پر ٹنگے ایک بوسیدہ فوٹو فریم کی طرف بڑھنے لگا جس میں اس کے باپ کی تصویر تھی۔

ناظم اپنے باپ کی تصویر کے سامنے شکریہ کے بوجھ سے اپنا وجود جھکائے کھڑا تھا اور دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ کیونکہ وہ باپ کے مرنے کے بعد اکثر ماں کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتا۔

''تمہارے میاں نے مجھے کیا دیا؟ قرض اور تین تین بہنوں کی شادی کا بوجھ۔ کیا ضرورت تھی مزید بیٹے کی امید میں تین تین لڑکیاں پیدا کرنے کی انسان نہ ہوئے...... بلاؤ انہیں، ان کی شادیاں کریں'' ماں خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ وہ بے چاری کرتی تھی کیا اور کہتی بھی کیا۔ جوانی کے عالم میں ہی ناظم کے پچکے گال دھنسی دھنسی آنکھیں زرد چہرہ دیکھ کر ماں غم کے سمندر میں ڈوب کر جاتی، اس کا جی چاہتا کہ وہ ناظم کو گلے لگا کر خوب پیار کرے،

اسے تسلیاں دے اور کہے ''اللہ بڑا کارساز ہے، وہ وقت پر ہر کام کو انجام دے دے گا تو فکر نہ کر۔'' مگر وہ ناظم کو ہر وقت فکر، تردد اور غصے میں بھرا دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔

''ماں! اب ہم شبینہ، روبینہ، تحمینہ ی شادی بہت جلد کر دیں گے۔'' ناظم نے بہنوں کو محبت و شفقت سے دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔ ''لڑکے بھی دیکھ لئے ہیں۔ اپنی بہنوں کو خوب جہیز دے کر رخصت ریں گے۔''

پاگل تو نہیں ہو گیا؟ کیا بک رہا ہے؟'' ماں ناظم کے اس رویہ پر حیرت زدہ تھی مگر اسے خوش دیکھ کر بولی۔ ''بڑا جہیز دے گا، کب سے یہ تینوں ایک شلوار سوٹ کے لئے کہہ رہی ہیں وہ تو دے نہیں پا رہا ہے۔''

''اب سب ہو جائے گا ماں!'' اور ناظم نے ماں کو ایک کمرے میں لے جا کر اپنے ارادے سے آگاہ کیا کہ وہ اس فلیٹ کو بیچ دے گا اور اس سے جو روپیہ حاصل ہوگا اس سے پہلے شبینہ، روبینہ، تحمینہ کی شادیاں کرے گا اور باقی روپیہ سے گاؤں میں زمین خرید کر کھیتی باڑی کا کام کرے گا اور آرام سے زندگی بسر کرے گا۔ اس نے کہا کہ اس کی صحت کتنی خراب ہے، کلکتہ کی آب و ہوا بہت زہر آلود ہوگئی ہے۔ یہاں کا ہر تیسرا چوتھا آدمی مریض ہے، یہاں کا ہر انسان بغیر سگریٹ پیئے اپنے سانسوں کے ذرایہ روزانہ بیس سگریٹوں کا دھواں پیتا ہے۔ دیہات کی تازہ ہوا سے اس کی صحت بحال ہو جائے گی۔

ماں اس کے ارادوں سے بہت خوش ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ وہ گاؤں میں اپنے لوگوں کے درمیان رہے۔ آج سے جب پینتیس سال قبل وہ اپنے شوہر کے ساتھ کلکتہ آ رہی تھی تو وہ ایک بار پھر اسی طرح روئی تھی جیسے پہلی بار میکے سے سسرال جا رہی تھی۔ اس وقت سے وہ اسی فلیٹ میں پچاس روپے ماہوار کرائے پر رہتی تھی۔ ''اس فلیٹ کا کتنا روپیہ مل جائے گا؟'' ماں تجسس سے بولی۔

یہ پگڑی اور سلامی کا زمانہ ہے۔ فلیٹ کی کنڈیشن ذرا خراب ہے ورنہ چھ لاکھ سے کم نہ ملتا۔ پھر بھی چار لاکھ تو کوئی بھی بنس کر دیدے گا۔ اگر کوئی مارواڑی خریدار ہو تو اور زیادہ بھی مل سکتا ہے۔ ناظم ماں کو سمجھا رہا تھا مگر کوئی مارواڑی خریدار نہیں ملے گا کیوں کہ مسلمان محلوں میں گندگی زیادہ ہوتی ہے۔ غنڈہ گردی بھی بہت ہوتی ہے۔ فلیٹ بیچنے کے بعد غنڈوں کو بھی کچھ نذرانہ دینا ہی ہوگا۔''

''کیوں دینا ہوگا غنڈوں کو؟'' ماں کے جملہ میں حیرت اور خفیف سا غصہ تھا۔

''کلکتہ کے عوام پر تین طرح کے لوگوں کی حکومت ہے۔ ایک پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی، ایک رائٹرس بلڈنگ کے کرسی نشین بابوؤں کی اور ایک ہمارے درمیان رہنے والے خطرناک غنڈوں کی۔'' ناظم ماں کو سمجھا رہا تھا دہلی اور رائٹرس بلڈنگ والے تو سال میں ایک ایک بار ہی بجٹ کا بوجھ لادکر پریشان کرتے ہیں مگر ہمارے محلے کے سرکاری لوگ تو صبح شام بوجھ لادا کرتے ہیں۔ چندہ کے نام پر مکان خریدا تو انہیں نذرانہ پیش کرو۔ مکان بیچو تو انہیں ٹیکس دو۔''

''سلام علیکم ناظم بھائی۔'' ناظم نے ڈر سے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کلب میں مجھے بلالیا ہوتا، کیوں تکلیف کی۔''

''کچھ ضروری بات ہے۔'' ستار سنجیدگی سے بولا۔

''سلطان بھائی کی شادی طے ہوگئی ہے؟'' ماجد نے کہا۔

''سلطان بھائی کی شادی طے ہوگئی ہے؟'' ناظم نے جلدی سے اسی کے لب ولہجہ میں خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔'' کہاں طے ہوئی ہے شادی''

''نیتا جی سابق کونسلر اصغر علی خان صاحب کی بیٹی سے۔'' ماجد خوش ہوکر بولا۔

''ارے باپ رے باپ! اتنے بڑے نیتا کے گھر میں...... بھیا کی قسمت کا جواب نہیں۔'' ناظم نے حیرت اور خوشی کا مصنوعی اظہار کیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا جن غنڈوں کو اصغر علی خان جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل کر سماج کو تحفظ دے سکتا تھا ان میں سے ایک کو اپنا داماد بنا کر غنڈہ گردی کو فروغ دے رہا ہے۔ شاید وہ اور بڑا نیتا بننے کی کوشش میں لگ گیا ہے۔ کاش! وہ بھی غنڈہ ہوتا۔

''ماجد بھائی!'' ناظم سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔'' میں ان کی شادی کے موقع پر حسب اوقات تحفہ لے کر حاضری دوں گا۔''

حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔ تحفہ میں فلیٹ خالی کردو۔'' ستار نے حکم صادر کردیا۔

ناظم کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا اور زور سے ہنسا اور ماجد کے کاندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔'' کیا خوب تحفہ مانگا ہے۔''

''ستار نے ٹھیک کہا۔'' ماجد نے ناظم کا ہاتھ غصہ سے جھٹک کر کہا۔'' کل شام سے

پہلے یہ فلیٹ خالی ہو جانا چاہئے۔''

''مگر ماجد بھائی ہم لوگ کہاں رہیں گے؟'' ناظم خوف سے لرز گیا۔

''فٹ پاتھ پر'' اور ایک گھونسہ ایسا جمایا کہ ناظم چکرا گیا۔ شبینہ اپنے بھائی کی ہمدردی میں دوڑ پڑی۔ ناظم کو اٹھایا اور دونوں غنڈوں کو گالیاں دینے لگی۔

''اے لڑکی۔'' ستار نے شبینہ کی کلائی زور سے پکڑ کر کہا۔ ''زیادہ بن مت کر۔ ہم لوگوں کی تم تینوں پر نظر ہے، ہاتھ پاؤں باندھ کر سوناگاچھی میں بٹھا دیں گے۔''

ناظم نے ایک طمانچہ شبینہ کو مار کر گھر کے اندر بھیج دیا اور پھر ان دونوں سے رحم کی بھیک مانگنے لگا مگر وہ دونوں فلیٹ خالی کرنے کے لئے سخت وارننگ دے کر چلے گئے۔

ناظم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دونوں ماں بیٹے محلہ کے لوگوں کے پاس گئے اور انہیں متحد کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ ہم ایک ہو کر ان چند سماج دشمن عناصر سے مقابلہ کر کے انہیں شکست دے سکتے ہیں مگر کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ سب نے صرف ہمدردی کے اظہار پر اکتفا کیا۔

ناظم اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ سلطان بھیا کے دربار میں ملزم کی طرح حاضر ہوا اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر خدا اور رسول کا واسطہ دے کر گڑگڑایا مگر بے سود۔ الٹے چند تھپڑوں کا نشان چہرہ پر لے کر کلب سے لوٹ گیا۔

ناظم بڑی بے بسی کی حالت میں نیتا جی اصغر علی خان صاحب کی کوٹھی پر حاضر ہوا۔ بہت انتظار کے بعد شان بے نیازی سے نیتا جی سامنے آئے۔ ناظم نے رو رو کر تمام حالات سنائے مگر نیتا جی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تب ناظم نے قوم و سماج اور ملک کے مفاد میں کہے جانے والے جملوں کا حوالہ دے کر اس معاملہ کا حل چاہا مگر نیتا جی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

کئی لوگوں کے مشورے سے تھانہ میں کیس لکھوانے اور سرکاری مدد مانگنے گیا مگر وہاں جا کر اسے احساس ہوا کہ اسے فلیٹ سے بے دخل کرنے کے لئے سب کی ملی بھگت ہے۔ تھانہ کے انچارج افسر نے نیتا جی اور سلطان بھیا کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔

آخر کوئی اخلاقی راستہ نظر نہیں آیا تو ایک ویلفیئر سوسائٹی میں گیا اور اپنا کیس پیش کیا۔ مقابلہ کے لئے اس سے ایک ہزار روپیہ مانگا گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ گھر کی کئی قیمتی چیزوں

کوپیج کر اس نے روپیہ جمع کر دیا تو اس ویلفیئر سوسائٹی کے باس نے بتایا کہ وہ جگہ جہاں اس کا فلیٹ ہے اس کے علاقے میں نہیں ہے اس لئے وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر اسے بے دخل ہونے کے بعد رہنے کے لئے کوئی جگہ نہ ملے تو کچھ دنوں تک اس کلب میں پناہ گزیں ہوسکتا ہے۔

ناظم اب بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ معمولی سا احتجاج بھی نہ کرسکا۔ شکست خوردہ قدموں سے گھر لوٹ گیا۔ گھر میں سب مل کر خوب روئے۔ جب دل کچھ ہلکا ہوا تو سبھی ایک ہی بات سوچنے لگے کہ بے گھر ہوکر کس کے گھر جایا جائے۔ ان کے رشتہ دار اور ملاقاتی سبھی نہایت مخلص ہیں مگر کس قدر مجبور ہیں۔ ایک ایک کمرہ میں کئی کئی لوگ رہتے ہیں۔ انہیں کہاں جگہ دے پائیں گے۔ وہ انہیں کھانا دے سکتے ہیں، ہمدردی جتا سکتے ہیں، مگر رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں دے سکتے۔

وہ لوگ اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ سلطان بھیا اپنے دونوں شاگردوں کے ساتھ آیا اور ہمدردی کے چند بول بول کر پندرہ ہزار روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ناظم نے اسے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور اپنا سامان سمیٹنے میں لگ گیا پھر اس ویلفیئر سوسائٹی میں پناہ لی۔ سوسائٹی کے کارکنوں نے توپسیا میں ایک کمرہ بھی ان کے لئے دلا دیا۔ جب یہ لوگ اپنے مستقبل کی پناہ گاہ کی طرف جارہے تھے تو سبھی رو رہے تھے۔ پتہ نہیں ان کے آنسوؤں میں کون سا صدمہ بہہ رہا تھا۔ غنڈوں سے شبینہ اور روبینہ کے نکاح کی خوشی کا جذبہ یا گھر سے بے گھر ہوکر شبینہ اور روبینہ کو بھی گنوا دینے کا احساس!

گیلی لکڑی کا دھواں

''ابھی ہمارے سماج میں یہ حق عورتوں کو نہیں دیا گیا ہے کہ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامیوں پر سر عام مردوں کی طرح اظہار خیال کریں۔'' طاہر کے دل کا نہان خانہ رضیہ کے اس جملہ سے منور ہو گیا جس میں برسوں سے اداسیوں کے اندھیروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

رضیہ اپنی ازدواجی زندگی سے بے زار ہے، اس کا احساس تو اسے اسی دن ہو گیا تھا جس دن وہ اس کی بیٹی فرحت کو ٹیوشن پڑھانے پہلی بار گیا تھا۔ وہ ابھی چھ سالہ فرحت کی ابتدائی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ بڑھاپے کی راہ پر گامزن بھاری بھرکم جسم لئے اس کا شوہر آیا اور آتے ہی اس نے اپنی بتیسی نکال کر ایک شیشہ کے گلاس میں رکھی جس میں پہلے ہی سے پیلے رنگ کا کوئی محلول تھا۔

''رضی ذرا بوا کو بھیجنا۔'' اس کے الفاظ میں بڑی محبت تھی۔ مگر دانت نہ ہونے کی وجہ سے کسی کھوسٹ بڈھے کی غیر متوازن آواز لگ رہی تھی۔

''بوا بازار گئی ہے۔'' ایک تیز ترنم ریز آواز ڈرائنگ روم کی دیواروں سے ٹکرائی۔ اس کی نگاہیں آواز کے تعاقب میں اس سے ٹکرا گئیں۔ ایک قیامت دروازے سے داخل ہوئی۔

''اسے اپنے بیڈ روم میں رکھ دو''۔ اس نے دانتوں والا گلاس رضیہ کی طرف بڑھایا۔ اس کی شربتی آنکھوں میں ناگواری کے کئی ڈورے ابھر گئے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں گلاس کو دیکھا پھر اپنے پوپلے شوہر پر ایک نظر ڈالی اور طاہر کو دیکھتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

طاہر پابندی سے فرحت کو پڑھانے آنے لگا۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں دیتا تھا۔ لیکن کافی مستعدی سے پڑھاتا تھا۔ اس دوران اپنی تمام تر توجہ فرحت پر ہی مرکوز رکھتا۔ البتہ کبھی کبھی صوفے پر بیٹھی رضیہ کو بھی دیکھ لیتا جو رسالوں کی ورق گردانی کرتی ہوئی یا پھر طاہر کو دیکھتی ہوتی۔ کئی دفعہ دونوں کی نظروں کا تصادم بھی ہوا۔
''بھابی! عبدل یا بوا سے ایک گلاس پانی منگوایئے۔'' طاہر نے نظریں جھکائے اس سے التجا کی۔

''اچھا......!'' صبح کے وقت جیسے کسی مندر میں ناقوس بج اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد رضیہ پانی کے بجائے ایک خوبصورت گلاس میں کوئی مشروب لئے قریب جا کھڑی ہوئی۔ خوشبو کے ایک جھونکے نے اس کے دل ودماغ کو معطر کر دیا۔ ''شوق فرمایئے۔''
طاہر آج پہلی دفعہ رضیہ کو اس قدر قریب سے دیکھ رہا تھ۔ ان کا یہ شگفتہ چہرہ کسی تالاب میں کھلے ہوئے کنول کی طرح تھا یاقوتی ہونٹ، کشادہ پیشانی، خمار بھنویں اور ان میں دلوں تک اترنے والی تیز نگاہیں۔ اس نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔
''شوق فرمایئے۔'' رضیہ نے اپنی بات دہرائی اور اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیلنے لگی۔
''جی!'' طاہر جیسے کسی خواب سے چونک کر جاگ اٹھا...... ''آ......آپ نے کیوں تکلیف کی اور پھر اس کی کیا ضرورت تھی۔''
''ضرورت تھی جب ہی تو لے آئی۔'' رضیہ کے منہ سے گلاب کی پنکھڑیاں جھڑ رہی تھیں۔ اب تک آپ بوا یا عبدل کے ہاتھوں چائے یا پانی پیتے رہے ہیں۔ اسے اتفاق ہی کہئے کہ اس وقت بوا اور عبدل میں سے کوئی موجود نہیں۔'' رضیہ اب بھی طاہر کے قریب کھڑی تھی اور وہ اس کے انداز تکلم سے محظوظ ہو رہا تھا ''اور پھر اس میں تکلف کی کیا بات ہے؟ آپ میری بیٹی فرحت کو پڑھاتے ہیں۔ کتنا وقت اس کے پیچھے دینے لگے ہیں۔ وہ بھی

آپ سے مانوس ہوگئی ہے۔آپ کی غیر موجودگی میں وہ آپ کا بہت ذکر کرتی ہے؟''

طاہر کو ایسا لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔وہ سچ مچ کچھ دنوں سے ڈیڑھ گھنٹہ سے بھی زیادہ وقت دینے لگا تھا۔اس نے کئی دفعہ سنجیدگی سے اس پر بھی غور کیا تھا مگر کوئی تشفی بخش وجہ معلوم نہیں ہوسکی تھی۔وہ اتنا ضرور محسوس کرتا رہا کہ اسے یہاں ڈرائنگ روم میں رضیہ کی موجودگی سے سکون ملتا ہے۔

''آپ کا نام طاہر نقاش ہی ہے نا؟'' رضیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

''ہاں ......'' اس کی نگاہیں رضیہ کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔وہ سوچنے لگا کہ اس غیر متعلق سوال کے کیا معنی جب کہ اس کا نام بہت پہلے ہی سے وہ جانتی ہے۔

''طاہر نقاش صاحب!'' اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹوں کی لہریں ہچکولے کھا رہی تھیں۔'' کتنے دلوں پر اب تک آپ نے اپنا نقش مرتب کیا ہے؟''

''جی!'' اس غیر متوقع سوال پر وہ بھونچکا رہ گیا مگر رضیہ کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی شوخی نے اسے سہارا دیا اور اس نے اس کے سہارے ایک دلفریب انداز میں ایک خوبصورت شعر پڑھا۔

چھا رہی ہے آج ہر سو کوہ صحرا پر بہار
کھیتیاں سوکھی پڑی ہیں بادلوں کے شہر میں

''اس معاملہ میں بندہ بہت بدنصیب ہے۔'' اس کی بائیں آنکھ دانستہ دب گئی۔

ماحول یکلخت بوجھل ہوگیا۔وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگا اسے یہ خیال تمام رات اذیت دیتا رہا کہ اگر رضیہ نے اس کا ذکر اپنے شوہر سے کر دیا تو؟

طاہر رضیہ کے خیالوں میں محو لب سڑک میٹرو ریلوے کے تعمیر کے سلسلہ میں ٹوٹتی ہوئی ایک بلند عمارت کو دیکھ رہا تھا کہ گھڑی نے سات بجنے کا اعلان کر دیا اور وہ بے دلی کے ساتھ کمرہ سے نکل گیا۔آج اس کا ارادہ ٹیوشن پڑھانے کے لئے جانے کا بالکل نہ تھا مگر اس کے قدم غیر ارادی طور پر رضیہ کے گھر کی طرف اٹھتے چلے گئے۔اپنے مقررہ وقت سے ۴۵ منٹ کی تاخیر سے جب وہ اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اسے ہر سمت ایک عجیب خاموشی کا احساس ہوا تو وہ واپس ہونا چاہ رہا تھا کہ معصوم فرحت اچھلتی کودتی سامنے آگئی۔

''انکل آپ آگئے بڑی دیر کر دی...... کہاں رہ گئے تھے؟ کیوں دیر کر دی؟ فرحت

نے سوالوں کی بوچھار کرنا شروع کر دیا۔

''ہاں۔ بیٹی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔'' طاہر نے شفقت سے اسے گود میں اٹھالیا۔

''طبیعت ناساز تھی تو نہیں آنا تھا۔'' فرحت کے والد کی آواز پشت کی طرف سے آئی۔

طاہر کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''جایئے آرام کیجئے گھر پر کچھ مہمان بھی آنے والے ہیں۔''

''جی!'' طاہر اس سے اور زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور جانے کے لئے دروازہ کی طرف مڑ گیا۔''

''چائے پی کر جایئے۔'' فرحت کے والد کی آواز پر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اسے خود حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر کمزور کیوں پڑ گیا۔ ''ابھی بوا سے بھجواتا ہوں۔''

''ممی امراؤ جان کا ویڈیو کیسٹ وحیدہ آنٹی کے یہاں سے لانے گئی ہے۔'' فرحت اس کے مقابل کے صوفہ کے بازو پر بیٹھی ہوئی بولی۔

''ممی نے آپ کو سلام کہا ہے۔''

''اچھا طاہر کو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا اس نے اچھل کر فرحت کو اپنے بازو میں اٹھا کر چوم لیا اور بڑے پیار سے تجسس بھرے لہجے میں کہا ''اور کیا کہا؟''

''اور تو کچھ نہیں کہا۔'' فرحت نے بڑی معصومیت سے اپنے ننھے ہاتھ کو ہوا میں لہرایا اور لہراتے ہوئے کہا کہ ''سنو'' طاہر نے رازدارانہ انداز میں فرحت سے کہا۔ ''ممی سے کہنا انکل نے آپ کے سلام کا جواب دیا اور سو بار سلام کہا ہے۔''

''انکل آپ بہت گندے ہیں۔'' اور وہ اس کی گود سے اتر گئی۔ فرحت کی اس حرکت پر وہ حیران رہ گیا۔'' آپ مجھے جھوٹ بولنا سکھا رہے ہیں۔'' ممی کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اور ایک بار سلام کہہ کر سو بار سلام کہنے کو کہہ رہے ہیں۔

''اوہ سویٹی!'' اور پھر اسے گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی پر کئی بوسے ثبت کر دیئے۔

''وعلیکم السلام اب تو ہو گیا...... لیکن پاپا کے سامنے مت کہنا۔''

''ممی نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔'' فرحت حیرت سے بولی۔

طاہر کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا اسے ساری کائنات جھومتی گاتی محسوس ہونے لگی اور وہ خود خوشیوں سے سرشار نیچے آ گیا۔

رابندر سروبر سے اٹھتی ہوئی عطر بیز ٹھنڈی ہوا میں شاردا اپارٹمنٹ کی ساتویں منزل

کی بالکنی طاہر کو قلبی سکون مہیا کر رہی تھی۔ وہ ایک ٹک سروبر کے پیڑوں کی جڑوں میں بیٹھے جوڑوں کو شام کے سرمئی دھندلکوں میں دیکھ رہا تھا کہ رضیہ اس کی محویت میں چائے کے ساتھ مخل ہوئی۔ اس نے رضیہ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اس کے چہرہ پر شبنمی پھولوں کی مسکراہٹ کسی پر اسرار معنی کا پتہ دے رہی تھی اس نے سروبر میں بیٹھے پیار کرنے والے جوڑوں کو پھر دیکھا اور کہا کہ اسے پیار کرتے ہوئے جورے کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔

''اور پیار کرنے میں؟ رضیہ کی مسحور کن آواز اور معنی خیز جملہ اس کے دل کے نہاں خانے میں بازگشت کرنے لگا۔

''پیار کرنے میں؟'' طاہر نے رضیہ کے جملہ کو دہرایا جو پر درد اور حسرت آلود تھا۔

''قدرت نے غریبی دے کر اس دولت سے محروم کر دیا ہے۔ ویسے بھی اپنی قسمت کھوٹی ہے۔ بیوی بھی ملی تو......؟''

''آپ شادی شدہ ہیں؟'' رضیہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''آپ بڑے وہ ہیں۔ اتنے دنوں سے یہ بات چھپائے رکھی''۔ رضیہ کے لہجے میں جلن اور ہلکی سی حسد کی آمیزش تھی۔ ''بیوی بھی ملی تو کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔''

ہمارے ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں۔'' اس کے جملہ میں حسرت پوشیدہ تھی۔

''کیوں؟'' کیا وہ خوبصورت نہیں؟'' رضیہ کی آنکھیں تجسس سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''یہ بات نہیں، وہ خوبصورت بھی ہے جوان بھی ہے بالکل آپ کی طرح۔'' اس نے رضیہ کے چہرہ کو پڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے خیالات ایک دوسرے کے قطعی خلاف ہے۔ مجھے تو اس دور رہنے میں سکون ملتا ہے۔''

''ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔'' اب رضیہ کے چہرہ پر دنیا بھر کا درد سمٹ آیا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ......آپ کو سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ ازدواجی زندگی کی ناکامی کا اثر مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ پڑتا ہے......آپ مرد ہیں، ادھر اُدھر بھی منہ مارتے ہوں گے اور وہ......؟''

''بھابی آپ عورت ہیں نا۔'' طاہر نے ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے اپنی صفائی میں کہا۔ ''اس لئے آپ اس اجڈ گنوار عورت سے اظہار ہمدردی کر رہی ہیں۔ ذرا آپ میری جگہ آ کر میرے دل میں جھانکئے۔ ایک بیوی کے پیار کے لئے کتنا بے چین ہے......میرا خیال ہے کہ مرد چاہے جتنا ادھر اُدھر منہ گھوم لے مگر سکون بیوی کے پہلو میں ہی ملتا ہے......''

طاہر اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا مگر اس کا آخری جملہ صداقت سے پر نظر آیا۔ کیسی بے فکری سے فرحت کے پاپا اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور وہ ارمانوں کی آگ مین جلتی سسکتی رہتی ہے، کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ اف یہ کیسی زندگی ملی ہے۔ یہ ظالم مرد کب تک عورتوں کا استحصال کرتے رہیں گے۔ وہ کیوں پچاس سال کے ہو کر پندرہ سال کی لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں۔ وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ عورت دولت کی نہیں بلکہ پیار کی بھوکی ہوتی ہے۔ عورت مہارانی ہو کر بھی صرف پیار کے سہارے ایک فقیر کی جھونپڑی میں زندگی گزار سکتی ہے۔ وہ مر کیوں نہیں جاتی؟

جنسی نا آسودگی کے باعث اس کا ذہن اکثر جوانی کی رنگین خیالوں سے لبریز ہو جاتا اور وہ سوچتی کہ کاش کوئی ایسا ہوتا جس کے سینہ پر سر رکھ کر اس کے سینہ کے بالوں سے الجھتی کھیلتی اور وہ پیار سے اس قدر زور سے دباتا کہ اس کی ہڈیاں چٹخ جاتیں۔ اسے جنم جنم کا سکون مل جاتا...... تین بچوں کی ماں بھنڈاری اس کی پڑوسن اپنے شوہر کے وحشیانہ انداز میں پیار کرنے کی باتیں سناتی تو اس کا ہر لفظ نشتر کی طرح اس کے سینے کے پار اتر جاتا۔ وہ تڑپ جاتی سر درد سے پھٹ جاتا۔ آنکھوں سے دھواں نکلنے لگتا جیسے اس کے دل میں کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔ اس کے جاتے ہی وہ باتھ روم میں گھس جاتی اپنے آپ کو بھگو لیتی مگر وہ آگ پانی سے کہاں بجھنے والی ہے۔ آخر وہ اس جاپانی مشین کا سہارا لیتی اور کسی حد تک وہی مشین اس سکون فراہم کرتی۔

''بھابی آپ کی ازدواجی زندگی؟'' رضیہ طاہر کے اس آخری جملہ پر چونک گئی۔ یک لخت اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگی۔ جیسے کسی زخمی ناگن کی آنکھیں۔

''ابھی ہمارے سماج میں یہ حق عورتوں کو نہیں دیا گیا ہے کہ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامیوں پر سر عام مردوں کی طرح اظہار خیال کریں۔''

گذشتہ کئی دنوں سے طاہر یہ بری طرح محسوس کر رہا تھا کہ رضیہ اس سے کترا رہی ہے وہ اس کے سامنے آتی تو ہے مگر ایک چھلاوے کی طرح ایک نگاہ غلط بھی اس کی طرف نہیں اٹھاتی وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

''تم سے ملنے سے پہلے میں ایک پیاسی ندی تھی......'' رضیہ اس سے آگے کچھ اور

کہتی کہ طاہر نے اس کے پھول سے شگفتہ چہرہ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی پر افشاں مانگ کو چوما پھر پیشانی دونوں آنکھیں، رخسار، ہونٹ اور گردن۔

''اور اب ......'' طاہر کی سانسیں بھاری ہوگئیں ...... '' اکھڑی ہوئی سانسوں کا زیر و بم۔ طاہر نے خیالوں کی حد سے نکلنے کے لئے اپنے سر کو جھٹکا۔ رضیہ کے رویہ میں اچانک تبدیلی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹتا اور روتا کہ کیوں رضیہ کی محبت کا روگ دل کو لگا لیا۔ ناکام ازدواجی زندگی کا غم کیا کم تھا۔

طاہر نے اسے جھنجھوڑا۔ ''بھابی! مجھ سے کیا بھول ہوگئی مجھے معاف کر دیجئے۔ میں دل کی عمیق گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں کیوں میرے سامنے آنا اور باتیں کرنا چھوڑ دیں! یہ بیر کیوں بھابی!''

نقاش ......طاہر ......'' رضیہ چیخ کر اسے چپ کرنے میں کامیاب ہوگئی اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہا '' طاہر تم سے کوئی بھول نہیں ہوئی۔ بھول مجھ سے ہوئی میں بھول گئی تھی کہ میں ایک شادی شدہ ہوں، مشرقی خاتون اور اپنی بیٹی فرحت کی ماں ہوں۔ تم اس کے ٹیچر اور غیر محرم۔'' ماحول بوجھل ہوگیا۔ طاہر اسے دیوانوں کی طرح ٹکٹکی باندھے آبدیدہ نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ دنیا پر ہمیشہ سے تم مردوں کا غلبہ رہا ہے اس لئے خود ساختہ حق کے تحت شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی تمہیں حق حاصل ہے کہ تم محبوبائیں رکھو، دوسری تیسری اور چوتھی بیوی جمع کرو اور میں تم مردوں کی دنیا کی مظلوم و محکوم عورت ہوں۔ ازدواجی زندگی چاہے جہنم ہی کیوں نہ ہو ہر حال میں شوہر کا دم بھرنا ہے۔

سند

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندستانی فوجوں نے حضرت بل درگاہ سے اپنا محاصرہ ہٹالیا تھا۔'' احمد شاہ نماز سے فارغ ہوکر مجھ سے پھر مخاطب تھا۔ دہشت گرد پھر سے حضرت بل درگاہ کو اپنے قبضہ میں نہ لے لیں اس لئے بڑی تعداد میں فوجیں اس کے آس پاس تعینات تھیں۔ میری ڈیوٹی حضرت بل درگاہ کے دروازے کے باہر تھی۔ عقیدت مند ونمازی حسب معمول آزادی سے آنے جانے لگے تھے مگران کی نگاہیں فوجیوں کے دلوں میں چھید کردینے والی ہوتیں۔ خاص کر کشمیری فوجیوں کوان لوگ نفرت کی نظر سے دیکھتے۔ ہم کشمیری فوجیوں سے امید رکھتے ہیں کہ ہم ان کا ساتھ دیں اور اپنے بندوق کی ساری گولیاں ان ہندستانی فوجیوں کے سینے میں اتار دیں جو بقول ان لوگوں کے ان کے بے گناہ رشتے داروں کو خصوصی طور پر مسلم کشمیری نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں شہید کردیتے ہیں۔ مجھے مسلمان سمجھ کر بہت سے لوگوں نے یہاں تک کہ میرے گھر کے افراد بھی مجھ سے کہتے کہ حکومت ہند جسے دہشت گرد کہتی ہے یہ مجاہد آزادی ہیں۔ انگریز حکومت میں بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں، چندر شیکھر آزاد کو پھانسی نہیں دی گئی تھی۔ پھانسی کی سزادی گئی تھی گرچہ وہ سب محترم شخصیت تھے اور آزادی ہند کے بعد وہ سب مجاہد آزادی کہلائے۔ ویسے ہی یہ سب کشمیری آزادی کے بعد مجاہد آزادی کہلائیں گے۔ میں ان لوگوں کی بے تکی باتوں کا کیا جواب

دیتا۔ کشمیر کی آزادی مجھے بھی بہت عزیز ہے مگر دستور ہند کے دائرے میں، ہم دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتے ہیں کہ ہمارا کشمیر جنت نظیر ہی رہے۔ غارت گری قتل وخون کا بازار گرم دیکھ کر ہمارا بھی دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ہم کشمیری فوجی تو دوہری مار سے مر رہے ہیں، اپنوں کی مار اور پرائے کی مار، ہم کشمیری فوج وفاداری اور غداری کے درمیان کی صلیب پر ہر وقت مصلوب ہوتے ہیں۔ اگر کسی تنگ نظر افسر کے ماتحت ہوئے تو اپنے ہی کسی بھائی کو شہید کر کے وفاداری کی ثبوت دینے کی ضد ہوتی ہے ورنہ غداری کا مہر ماتھے پر داغ کر مارا جاتا ہے۔

میں وہ حادثہ بھولے نہیں بھول سکتا۔ میرے افسر نے ایک کشمیری فوجی کو میرے سامنے ہی ایک نہایت خوبصورت جواں سال لڑکے کو گولی مارنے کا حکم دیا۔ اس فوجی کے انکار کرنے پر افسر نے اسے غدار کہہ کر گولی سے اڑا دیا۔ میرے تیور دیکھ کر ممکن تھا کہ وہ مجھے بھی نشانہ بناتا مگر میں نے فوراً اس افسر کو گولی مار دی اور نہ چاہتے ہوئے مصلحتاً اس نوجوان کو بھی گولیوں سے بھون دیا۔ ایک دہشت گرد کو ایک فوجی اور ایک افسر کو گولی مارنے کے جرم میں میں نے اسے ہلاک کر دیا۔

احمد شاہ بہت دیر تک خالی آنکھوں سے گھورتا رہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بھئی فاروق! ہم بڑے بدنصیب ہیں یہ وردی......؟''

''کیا ہوا اس وردی کو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس وردی کو کچھ نہیں ہوا، میاں! مگر میں اس وردی کی وجہ سے کافر ہو گیا۔'' احمد شاہ نے جیسے ایک راز کا انکشاف کیا۔

''آں!'' میں چونک گیا۔

''لعنت ہے!'' اس نے لعنت کس پر بھیجی میں نہیں سمجھ سکا اور پھر وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ ''جمعہ کے روز حضرت بل درگاہ میں آں حضرت ﷺ کی موئے مبارک کی زیارت کے لئے زائرین عقیدت مندوں کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ اس بھیڑ میں دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ایک بڑی پیاری سی فرشتہ صفت بچی کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا اور بے خود ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔''

''چھوڑیئے میرا ہاتھ۔'' وہ نفرت سے اور بے خوف ہو کر بولی۔

''ہم نہیں چھوڑیں گے آپ کا ہاتھ۔'' میں نے بڑے پیار سے بچوں کی انداز میں تتلاتے ہوئے کہا۔

''چھوڑیئے'' اور وہ اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی سعی کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ ہیں میرا ہاتھ چھوڑیئے!''

میرے ایمان پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میرا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں مہینوں کا بیمار جیسا ہوگیا میری آواز بھی حلق میں پھنسی ہوئی کمزور سی نکلی۔ ''نہیں بیٹی میں...... نہیں ہوں!''

''نہیں! آپ...... ہیں!'' وہ پراعتماد اور مضبوط انداز میں بولی۔

''نہیں! میں...... نہیں ہوں!!'' میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''پھر آپ نے میرے ابو اور بھیا کو کیوں مار دیا؟'' وہ مجسم سوال ہوگئی۔ اس کی معصوم آنکھیں میری آنکھوں میں کسی ظالم کی انگلیوں کی طرح کھب رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں ایک عظیم غم ایک پہاڑ سا درد آنسو کی شکل میں لرز رہا تھا۔'' وہ تو عیدگاہ سے عید کی نماز پڑھ کر آرہے تھے۔ ! اس وردی والے سب ...... ہوتے ہیں اور سب مسلمانوں کو مارتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں بیٹی!'' میں بہت کمزور اور لاچار ہوگیا۔

''ایسی ہی بات ہے!'' اس نے جیسے یقین سے کہا۔ ''اور یہی سچائی ہے۔ تم سب وردی والے...... ہو اور مسلمانوں کے جانی دشمن!''

میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ میں رات بھر سو نہ سکا اس کے ابو اور بھیا کی انجانی موت آنکھوں کے سامنے رہی اور وہ مجھ سے بار بار پوچھتی رہی۔

''میرے ابو اور بھیا نے کیا تھا وہ تو نماز پڑھ کر آرہے تھے اسے کیوں مار دیا؟''

میں کئی روز اذیتوں کی صلیب پر مصلوب رہا اور اسے تلاش کرتا رہا کہ وہ کہیں پھر سے مل جائے تاکہ اس کا دل صاف کروں سارے وردی والے نہ ...... ہیں نہ وہ کشمیریوں کے دشمن اور نہ ہی مسلمانوں کے دشمن بلکہ یہ وردی والے کشمیر میں امن کے رکھوالے ہیں کشمیریوں کے خیر خواہ ہیں ان کے محافظ ہیں اور دوست ہیں۔ اور میں تو سچا اور پکا مسلمان بھی ہوں۔

آخر ایک روز پھر مجھے وہ مل ہی گئی اور اسے یقین دلانے کی لاکھ کوششیں کیں کہ یہ

وردی والے نہ...... ہیں نہ دشمن بلکہ دوست ہیں۔ محافظ ہیں اسی لئے جب درگاہ کو دہشت گردوں نے اپنے قبضہ میں لے کر اس کے تقدس کو پامال کرنے کی کوشش کی تو ہم فوجیوں نے ہی اس کی تقدس کو بحال رکھا اور کوئی مرا بھی نہیں!''

''ہمیں مارنے کی آپ لوگوں نے پوری کوشش کی تھی۔'' وہ پھر یقین سے بولی۔ اس وقت درگاہ میں میں بھی موجود تھی۔ اپ لوگ تو یزید کے بڑے بھائی ثابت ہوئے۔ پانی کی سپلائی بند کردی اندر ہم جیسے کئی بچے مرتے مرتے بچے اور آپ لوگوں نے گولیاں بھی چلائیں۔ وہ دیکھئے کھڑکی۔'' وہ ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے نانی کا گھر ہے اس کمرے میں ماموا ور میں سوتی ہوں آپ کی گولیوں سے اس کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے۔''

میں اس چھوٹی سی بچی سے شکست کھا کر شرمندہ ہوگیا کہ اس وردی کو اس معصوم بچی کی نظر میں محترم نہ بنا سکا اور نحیف آواز میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں مسلمان ہوں۔''

''ابھی بھی آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ جو کچھ بھی بولتی یقین سے بولتی۔ ''اندر درگاہ میں نماز ہو رہی ہے اور آپ باہر کھڑے خود کو مسلمان کہہ رہے ہیں؟''

''بیٹی میں ڈیوٹی پر ہوں۔'' میں نے ایک کمزور سا بہانہ بنایا۔ ''میں ڈیوٹی کے بعد ساری نمازیں قضا پڑھتا ہوں۔''

''کتنے بجے آپ کی ڈیوٹی شروع ہوتی ہے؟'' وہ مجھے اس انداز میں گھیر رہی تھی جیسے مجھے...... ثابت کرنا اس کا فرض اولین ہو۔

''گیارہ بجے دن سے۔'' میں نے مختصر سا سچ کہا۔

''پھر میں آپ کو صبح نماز کے بعد درگاہ سے نکلتے ہوئے کیوں نہیں دیکھتی؟'' وہ فاتح کی طرح مخاطب تھی۔ میں خاموش ہوگیا مگر میں نے فوراً اس کے جملے کے کمزور پہلو پر وار کیا۔ ''بیٹی! تم تو بہت چھوٹی ہو اتنی صبح تم سو رہی ہوتی ہوگی۔''

''بالکل غلط!'' اس نے یقین سے کہا۔ ہم مسلمان ہیں ہمارے گھر کے تمام لوگ فجر کی نماز کے وقت اٹھتے ہیں۔ نانی، ممی، خالہ اور میں گھر میں نماز پڑھتی ہوں اور ماموں جان درگاہ میں نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ میں نماز پڑھ کر کھڑکی سے روز نمازیوں کو درگاہ سے نکلتے

دیکھتی ہوں۔ مجھے نماز اچھے لگتے ہیں!''

......''میں بھی مسلمان ہوں''میرے حلق میں یہ جملہ گھٹ کر رہ گیا اور میں ساکت و جامد بے وزن ہو کر رہ گیا۔

دوسری صبح جب میں درگاہ سے فجر کی نماز پڑھ کر باہر نکلا تو میری نظر بے اختیار اس ٹوٹے شیشے والی کھڑکی طرف اٹھ گئی۔ کہر آلود صبح کے اندھیرے میں ایک چھوٹا سا چاند مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر میرا استقبال کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے خدائی مل گئی ہو میں ایمان والا ہو گیا میں مسلمان ہو گیا۔ میں خوش خوش آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک وہ میرے روبرو آ گئی اور اس نے اپنی ننھی ننھی بانہیں پھیلا دیں۔

عبدل

''ایک عمر سے بیٹھا ہوں مگر محوِ سفر ہوں۔'' امیر حسن نے یہ مصرعہ پڑھا اور نکہت کے پہلو میں بیٹھ کر کہنے لگا۔ ''نکی! میں بہت تھکا ہوا ہوں، اس سہاگ رات کو کسی اور رات کے لئے امانت چھوڑ دو...... مجھے آرام چاہئے۔ مجھے آرام کرنے دو!'' اور بستر پر آس کے پاس کسی بوسیدہ دیوار کی طرح ڈھہ گیا۔

نکہت نے اپنا گھونگھٹ ہٹایا اور بھیگی آنکھوں سے امیر کے چہرے کا سنجیدگی سے جائزہ لیا۔ اُف! اس کے چہرے پر ہزاروں میل سفر کی تھکان نمایاں تھا۔ سفر کے گرد و غبار سے اس کا چہرہ اٹا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں پڑی سیاہی کو اس نے اپنے آنچل سے صاف کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر اپنے سرخ ہونٹوں کو اس پر رکھ دیا۔ چہرے کی ابھری ہڈیوں کو چوما اور اس کے بالوں میں ہمدردی سے اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنے لگی۔ جیسے وہ کچھ تلاش کر رہی ہو، اس سعی میں ماضی کی جوئیں اس کی انگلیوں کے نیچے کلبلانے لگیں۔

امیر حسن کتنا خوبصورت اور اسمارٹ تھا۔ زندہ دلی اور حاضر جوابی میں تو پوری یونیورسٹی میں وہ مشہور تھا۔ اس روز جب مالتی امیر حسن کا تعارف نکہت سے کرانے لگی تو امیر حسن نے مالتی کو روک کر کہا۔ ''صاحبہ! مجھ غریب کو امیر کہتے ہیں!'' نکہت حیرت سے اسے تکنے لگی۔

''یقین کیجئے محترمہ! مجھ غریب کو امیر ہی کہتے ہیں۔ جی ہاں! امیر حسن!''

نکہت کو وہ واقعہ تو آج بھی یاد آ رہا تھا۔ اس روز نکہت اپنی سہیلیوں کے ساتھ یونیورسٹی کینٹین میں کافی پی رہی تھی اور روما اپنے چلبلے پن سے سب کو محظوظ کر رہی تھی کہ وہاں سے امیر حسن کا گزر ہوا۔ روما نے اخلاقاً کہا ''امیر آؤ ہمارے ساتھ کافی پیو۔''

''تم لوگ پیو اور مجھے پیا سمجھو۔'' امیر لفظ ''پیا'' کو مضبوط انداز میں ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

ایک مختصر وقفہ کے لئے ماحول میں خاموشی چھا گئی اور سب کی نظر روما پر گڑ گئی۔ روما ہونقوں کی طرح سب کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئی۔ روما کی یہ حالت دیکھ کر سب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ قہقہوں کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب روما شرمندہ اور آبدیدہ ہوا اٹھ کر چلی گئی۔

لڑکیاں اس سے بات کرتے وقت حد درجہ محتاط رہتی تھیں۔ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے سوچ لیتیں کہ امیر کا جواب کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جس سے وہ تماشہ بن جائیں۔ پھر بھی لڑکیاں اسے گھیرے رہتیں۔

یونیورسٹی میں اس کی غیر حاضری نے سب کو متوجہ کیا مگر مالتی اور نکہت وجہ جاننے کے لئے اس کی رہائش گاہ تک پہنچ گئیں۔

امیر نے اپنی فطرت عین مطابق بغیر لاگ لپیٹ کے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا کہ اب تعلیم جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے کیوں کہ جو دیندار اس کی تعلیم کا بوجھ اٹھا رہا تھا وہ خود اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ اب تو اس کے خاندان کی کفالت کا بوجھ بھی اس کے سر آ گیا ہے۔ اس لئے اب وہ نوکری تلاش کر رہا ہے۔ دس روز میں اگر کہیں نوکری مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ اس کمرے کا کرایہ دے پانا بھی محال ہو جائے گا۔ اس لئے دوسری صورت میں اس شہر کو ہی چھوڑ کر گاؤں چلا جائے گا اور وہیں کھیتی باڑی کرے گا۔

''ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں، امیر!'' نکہت نے افسوس کا اظہار کیا۔

''تم لڑکیاں میرے لئے کیا کر سکتی ہو؟'' امیر حسن نے مسکرا کر کہا زیادہ سے زیادہ کرو گی تو میرے روم کا اپنے پاکٹ خرچ میں سے ایک یا دو ماہ تک کرایہ دے دو گی۔ نوکری تو نہیں۔''

خاموشی جب بوجھ بننے لگی تو مالتی اور نکہت اجازت لے کر جانے لگیں۔ ''پھر

ملیں گے۔''

امیر حسن نے کہا۔''اب نہیں ملیں گے۔''

''کیوں؟'' نکہت نے چونک کر دریافت کیا۔

''کرایہ نہیں دوں گا تو مکان مالک خود نکال دے گا۔'' وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

امیر گذشتہ تین مہینہ سے نکہت کی مدد سے نوکری تلاش کر رہا تھا مگر نوکری نہ ملنی تھی اور نہ ملی۔ نکہت امیر سے زیادہ پریشان اور غمگین تھی، جدائی کی تصور سے ہی اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ نکہت نے اپنی محبت کو قریب رکھنے کے لئے آخری کوشش کی اور کہا ''امیر جیگولو بنو گے؟''

''جیگولو!'' وہ زیر لب بڑبڑایا اور انگریزی کے اس لفظ کا معنی سمجھ میں نہیں آیا تو نکہت سے ہی اس کے معنی دریافت کیا۔''جیگولو کیا؟''

''جیگولو یعنی مرد طوائف!'' نکہت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ امیر غیر یقینی انداز میں اسے دیکھے جا رہا تھا اور نکہت اسے پر اعتماد لہجے میں بتا رہی تھی۔''تم دنیا کے پہلے جیگولو نہیں ہو گے۔ جیگولو کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ''پروس'' کی۔ مغربی ملکوں میں جیگولو بازاروں میں بیٹھتے ہیں مگر اپنے ملک میں جیگولو اکثر خوشحال گھروں میں رامو، سمبھو، کریم، اور عبدل کی صورت میں نوکری کرتے ہیں۔ مگر اب جیگولو اپنی آزاد سروس بھی دینے لگے ہیں اور ان کی ڈمانڈ دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ تم مرد اس سے بے شک ناواقف ہو مگر آزاد خیال اور خوشحال عورتیں بالکل اسی طرح واقف ہیں جیسے تم مرد کلکتہ کے بہو بازار اور سونا گاچھی سے دلی کے گوتم بدھ روڈ سے ممبئی کے پیلی کوٹھی سے واقف ہوتے ہو۔ تمہیں یقین نہیں آرہا ہے نا؟ نکہت میر کی دلی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اپارٹمنٹس کے پبلک فون بوتھ پر لے آئی اور ٹیلی فون ڈائرکٹری سے ایک نمبر نکال کر کہا۔''یہ نمبر اس شہر کے ایک امیر علاقے کا ہے۔ اس وقت یہاں کے مرد اپنے اپنے بزنس میں مصروف باہر ہوتے ہیں۔'' ریسیور کان میں لگا کر نمبر ملایا۔''

ٹرن......ٹرن......ٹرن......'' دوسری طرف فون کی گھنٹی بجی۔''ہیلو!''

''ہیلو!'' نکہت نے کہا۔ میں جیگولو سروس سے بول رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے!'' آپ کی سروس کس طرح ہوگی۔'' دوسری طرف سے کسی صنف

نازک کی ہی آواز آ رہی تھی۔

''مطلب؟'' نکہت نے جاننا چاہا۔

مطلب یہ کہ آپ کا جیگولو میرے پاس آئے گا یا مجھے آنا ہوگا؟'' آپ کی ضرورت کے مطابق!'' نکہت نے کہا۔

ٹھیک ہے! میں آؤں گی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''جیگولو کی عمر کیا ہے اور چارج کیا ہے؟''

''عمر پچیس سال، کسرتی بدن، وزن پچپن کلو۔ اور میڈیم چارج تو آپ کی عمر کے حساب سے ہوگا۔'' نکہت ایک پیشہ ور بھڑوا کی طرح بات کر رہی تھی۔

دوسری طرف سے عورت نے اپنی عمر چالیس سال بتایا تو نکہت نے چار ہزار روپیہ معاوضہ بتایا۔ آخر میں ہاں نہیں کرتے کرتے سودا تین ہزار پر طے ہوگیا اور پھر اسے آنے کا آسان راستہ بتا دیا۔ امیر حیرت سے ساری باتیں سن رہا تھا آخر اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے نکہت سے اس طرح پوچھا جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو۔

''جس کام کے لئے ......'' اٹک اٹک کر شرم سے بولنے لگا۔ ''جس کام کے لئے ایک مرد ایک عورت کو روپیہ یا معاوضہ دیتا ہے، اسی کام کے لئے ایک عورت ایک مرد کو روپیہ یا معاوضہ کیوں دے گی؟''

''ضرورت کے لئے، جسمانی سکھ کے لئے، جسم کی آسودگی کے لئے۔'' نکہت ایک ایک لفظ پر وزن دے دے کر بول رہی تھی۔ ''آتم سمان کے لئے، سلف رسپیکٹ کے لئے اور مرد کو برابری کا احساس دلانے کے لئے ...... امیر!'' نکہت امیر کو خاموش اور متوجہ دیکھ کر آگے کہنا شروع کیا۔ ''آج دنیا کی آدھی آبادی، آدھی آبادی سے ٹکرا رہی ہے۔ آدھی آبادی اپنی برتری کی پوزیشن بچانے کے لئے سرگرم ہے اور دوسری آدھی آبادی اس کے برابری کرنے کیے لئے سرگرم ہے...... تمام اخلاقی برائیوں کی ماں یہ دوسری آدھی آبادی کی برابری کرنے کا منہ زور نامناسب جذبہ ہے۔''

امیر! میرا سبجیکٹ ہے سماج شاستر، اس لئے سماج پر میری گہری نظر ہے۔ تم یہ سب سن کر یہ مت سمجھنا کہ میں نے کسی جیگولو کی کبھی خدمت حاصل کی۔ میں ایک عورت ہوں، ایک عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے اور کرتی بھی ہے مگر اپنے پیار کو بانٹ سکتی ہے اور نہ بٹتا دیکھ

سکتی ہے۔ مگر صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرتا پیٹ بھرنے کے لئے روپیہ چاہئے اور روپیہ چاہئے اور روپیہ کمانا ایک شریف آدمی کے لئے اس دور میں کتنا مشکل ہے، تم واقف ہو گئے ہو، مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے کچھ روز یہ کام کر لو پھر یہ شہر چھوڑ دیں گے......"

"کون!" نکہت نے دروازے کے آڑ سے دریافت کیا۔ ایک خاص کوڈ روڈ پر نکہت نے مسکرا کر دروازہ کھول دیا اور خود باہر ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

گھڑی نے جب دو کا گھنٹہ بجایا تو نکہت چونک پڑی۔ امیر اب بھی اس کے بغل میں بے سدھ مردہ سا پڑا تھا۔ اس نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے خوبصورت اور جواں وجود کا عکس آدم قد آئینہ میں دیکھا۔ اپنے عکس کو بھرپور پیار کیا اور کمرے سے باہر نکل کر آہستہ آہستہ چھت پر آ گئی جہاں عبدل برساتی میں چٹائی پر سو رہا تھا۔

چوٹ

گھر کے تمام افراد یکجا ہو کر سوغاتیں دیکھ رہے تھے پاروتی نے اپنی سسرال سے ان کے لئے یہ سوغاتیں بھیجی تھیں بھیجا تھا۔ پاروتی نے گھر کے تمام افراد کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور بھیجا تھا......ایک مخملی جاء نماز، ایک خوبصورت تسبیح، ایک پیتل کا بدھنا اور رحمٰن کے لئے ایک۔رحمٰن جو اس گھر کا سب سے بزرگ شخص تھا۔ جسے وہ بھیا کہا کرتی تھی اور وہ واقعی اس کا بھائی تھا بھی۔ دونوں میں بچپن سے ہی بھائی بہن جیسا ہی پیار تھا۔ ان دونوں کی آپسی محبت دیکھ کر ہی ایک روز رحمٰن کے والد نے پارو کے پتا سے کہا۔

''رگھو! پارو مجھے دیدو۔''

''لے لو۔'' رگھو نے ہنستے ہو کہا۔ ''پاروتی لکشمی یہ دونوں تمہاری ہی بیٹیاں ہیں۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔'' رحمٰن کے والد نے پھر سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''میں پارو کو گود لینا چاہتا ہوں'' رگھو اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''ہاں رگھو!'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''خدا نے مجھے ہر طرح کی دولت دی ہے۔ بس ایک بیٹی کی کمی ہے۔ میرے رحمٰن کو اس کی ایک بہن پارو کی شکل میں مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' رگھو نے اسے چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''پارو آج

سے صرف تمہاری بیٹی۔''

''تو کل سے پارو بیٹی میرے گھر میں رہے گی'' رحمٰن کے والد نے خوش ہو کر کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے تمہارے اور میرے گھر میں۔'' رگھو کچھ فکر مند سا ہو گیا۔

''اور اگر کچھ فرق پڑتا بھی ہے تو میں پارو بیٹی کے لئے اسے مٹا دوں گا۔'' رحمٰن کے والد نے جوش میں کہا۔ ''آج سے میرے گھر گوشت نہیں پکے گا۔ سارے ہنڈیا برتن بدل دوں گا.............''

''بس، بس بس۔'' رگھو ہنستے ہوئے اس سے بغلگیر ہو گیا اور پھر دونوں زندگی کے ہر موڑ پر آخری سانس تک ساتھ ساتھ رہے۔ اسے صرف یہ دکھ رہا کہ رگھو پارو کا بیاہ نہ دیکھ سکا۔ وہ خود بھی پارو کے ہاتھ پیلے کرنے سے دنیا کو چھوڑ رہا ہے۔

رحمٰن کے والد کے انتقال کے بعد رحمٰن نے اس مبارک کام کو بڑی شان وشوکت سے انجام دیا۔ اور پارو کو اپنے گھر سے بالکل اسی طرح رخصت کیا جیسے اپنی سگی بہن ہو...... رخصتی کے وقت رحمٰن نے پارو کے پاؤں دھوئے، اپنے رومال سے اسے خشک کیا، گود میں اٹھا کر پالکی میں بٹھایا اور کہاروں کے ساتھ کاندھا دیتے ہوئے دور تک گیا۔ لوگ اگر اسے واپس نہ لاتے تو لگتا تھا، وہ اس کی سسرال تک چلا جاتا۔ وہ پارو کی جدائی میں اس قدر رویا کہ بس۔

پارو سال میں ایک دو بار ضرور اپنے مائیکے رحمٰن کے گھر آتی۔ کبھی اپنے پتی کے ساتھ تو کبھی اکیلے ہی۔ جب وہ اکیلے آتی تو مہینہ مہینہ بھر رہ جاتی...... پارو کے یہاں رہنے سے رحمٰن کے بعد جسے سب سے زیادہ خوشی ہوتی وہ ریحان تھا۔ کیونکہ پارو کے آجانے سے گھر کا ہر فرد سبزی خور ہو جاتا۔ سبزیاں ریحان کو بہت اچھی لگتیں۔

پارو بھی ریحان کو بہت پیار کرتی بالکل اپنے اکلوتے بیٹے رمیش کی طرح...... پارو نے اپنے بھتیجے ریحان کے لئے ایک سونے کی نب والی قلم بھیجی تھی...... ریحان بہت خوش تھا وہ اس سونے کی قلم سے ہیرے جیسا قیمتی چیز لکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پارو پھوپھی ماں کا نام لکھا۔ اپنے والد رحمٰن کا نام لکھا اپنے رمیش بھیا کا نام لکھا۔ ریحان خوشی خوشی اپنے والد کے پاس پھوپھی ماں کا بھیجا ہوا تحفہ دکھانے آیا تو اپنے باپ کو متفکر اور آبدیدہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''کیا بات ہے ابو!'' ریحا پریشان کن لہجہ میں دریافت کیا۔

رحمٰن نے جاءنماز، بدھنا اور تسبیح کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، پھوپھی ماں نے یہ سب آپ کے لئے بھیجا ہے۔'' ریحان پریشان تھا اگر پھوپھی ماں نے سب بھیجا ہے تو کیا غلط کیا۔

''ہاں!'' وہ سرد آہ بھر کر ریحان سے کہنے لگا۔ ''یہ وہی جاءنماز ہے جس میں نہ جانے میں کتنی نمازیں پارو کی سسرال میں ادا کیں، یہ وہی تسبیح ہے جس پر نہ جانے کتنے صد درود وسلام اس کی سسرال میں نے پڑھے ہیں، یہ وہ بدھنا ہے جس سے نہ کتنی بار پارو کی سسرال میں وضو کیا ہے...... پارو نے یہ سب میرے پاس کیوں بھیج دیا؟''

''ابو! آپ پھوپھی ماں کا خط پڑھیں!'' ریحان نے مشورہ دیا۔

رحمٰن نے بجھے دل سے اس خط کو پڑھنا شروع کیا، خط میں گھر کے ہر فرد کے لئے سلامتی اور خوشحالی کی دعا کرتے ہوئے آگے یوں لکھا تھا۔

''بھیا! آپ کی بہن پارو بھی ایک عورت ہے اور عورت کا مقدر ہمیشہ مرد ہی لکھتا رہا ہے، کبھی باپ بن کر، کبھی شوہر بن کر تو کبھی بیٹا بن کر...... بھیا! رمیش ایک پارٹی کا لیڈر بن گیا ہے۔ اس کے ساتھی سنگی ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف بولتے رہتے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایک روز اس نے مجھے بہت ڈانٹا بھی کیونکہ قبرستان میں شیو مورتی پرگٹ ہونے کا بھانڈا میں نے پھوڑ دیا تھا۔ بھیا! ان لوگوں نے کئی روز املی کے بیج کو پانی میں بھگونے کے بعد ایک روز رات کو قبرستان میں گڑھا کھود کر املی کے بیج نیچے رکھ کر اس پر شیو بھگوان کی مورتی بیٹھا کر مٹی سے دبا دیا تھا کئی روز بعد جب املی کے بیج میں انکور پھوٹنے لگے تو مورتی زمین چیر کر اوپر آ گئی...... ایک ہنگامہ مچ گیا، فرقہ وارانہ کشیدگی پھیل گئی تو میں نے یہ راز تھانے میں جا کر فاش کر دیا تب کہیں جا کر یہ معاملہ تھما۔

''بھیا! رمیش ایسا کیوں ہو گیا؟ وہ بہت ناسمجھ ہے۔ میں نے اسے ایودھیا جانے سے بھی بہت روکا تھا۔ بہت سمجھایا کہ ایودھیا مت جا۔ ایودھیا کے معنی سمجھو، یہ امن کی جگہ ہے۔ مگر وہ مجھ کمزور عورت کی بات کیوں کر سنتا۔ وہ گیا اور بابری مسجد توڑ آیا۔ محبت کی دیوار گرا کر آیا، ملک کے امن کو آگ لگا کر آیا۔ اسی سے شرمندہ ہو کر میں اپنے بھیا سے ملنے مائیکے نہ آ سکی ۔بھیا میں شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دو۔ ہو سکے تو رمیش کو بھی معاف کر دینا۔ وہ نادان ہے، اور میں مجبور ہوں کیونکہ اس کی ماں بھی ہوں...... بھیا! اب میرے گھر مت

آنا، یہ رمیش کا فیصلہ ہے۔ اس لئے بدھنا جا، نماز اور تسبیح بھیج رہی ہوں ۔ مگر آپ کی نماز کے لئے اس بدنصیب پارو بہن کا پاکیزہ آنچل ہمیشہ حاضر ہے۔

دو پھول بھیج رہی ہوں، ایک ابا حضور کے قبر پر بدنصیب بیٹی کی طرف سے آخری سلام کے ساتھ چڑھا دینا۔ جب رمیش ایودھیا جارہا تھا تو ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر دل ہی دل میں رمیش کی لمبی عمر کی منت مانگی تھی ...... بھیا معاف کر دینا!

آپ کی مجبور بہن

.... پاروتی

خط پڑھ کر کسی نے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ سب کو ایک چپ سی لگ گئی دوسری صبح رحمٰن نے اپنے باپ کی قبر پر پاروتی کی طرف سے عقیدت کا پھول پیش کیا پھر انجان پیر بابا کی درگاہ پر گیا، سجادہ نشین سے رمیش کی لمبی عمر کی دعا کرائی اور آفات و مصیبت سے بچنے کے لئے ایک تعویذ بھی لیا اور پھر ریحان کو پارو کے گھر بھیج دیا۔

ریحان کو دیکھ کر پارو کی بوڑھی آنکھوں میں بے پناہ چمک آئی، خوشی سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''جگ جگ جیو!'' کی دعا کے ساتھ اسے گلے لگا لیا اور اس کے سر اور چہرے پر خوب ہاتھ پھیرا لے۔ اور اس کی بلائیں لیں اور گھر کے ایک ایک فرد کے بارے میں تفصیل سے دریافت کیا۔ ریحان جب پارو پھوپھی کے پوچھ تاچھ سے فارغ ہوا تو پھر رمیش بھیا کی طرف متوجہ ہوا۔ رمیش نے بھی بناوٹی محبت کا اظہار کیا۔ گلے لگ کر گلے شکوہ بھی کیا اور اپنے کمرے میں لیجا کر جم کر ادھر اُدھر کی باتیں بھی کیں...... رمیش کا کمرہ کیا تھا بلکہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کے دیواروں پر تصویریں ٹنگی تھیں۔

بنکم چندرا، ساور کر، گوالکر، سردار پٹیل، کریم چھاگلا، حمید دلوائی، لال کرشن اڈوانی، اشوک سنگھل، ونئے کٹیا، سلمان رشدی، اوما بھارتی، بالا صاحب دیورس، بال ٹھاکرے، مرلی منوہر جوشی، سکندر بخت محمد عارف بیگ، ناتھورام گوڈسے وغیرہ وغیرہ۔

''رمیش! تم نے گاندھی جی کی کوئی تصویر نہیں لگائی!'' ریحان نے افسردگی سے کہا۔

''اس ہندستان میں گاندھی کی اب کوئی جگہ نہیں۔'' ریحان کو اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا لگا۔ گاندھی کو تو اتنا قیمتی اور خوبصورت راج گھاٹ دے ہی دیا گیا ہے۔

پھر رمیش اور ریحان میں کوئی سیاسی گفتگو نہ ہوئی اور صرف ریحان نے درگا کا وہ تعویذ اسے دیا۔ جسے اس نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور کمرہ کے ایک طاق پر جا کر رکھ دیا۔ ریحان کی نظر اس طاقچہ پر جم کر رہ گئی اور دل و دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہونے لگا......

بڑی مشکل سے اپنے حواس پر قابو پایا اور لڑکھڑائے قدموں سے وہاں تک گیا۔ طاقچہ کے اوپر لکھا تھا کہ ''فخر سے کہو ہم ہندو ہیں'' اور نیچے منہدم بابری مسجد کے اینٹ کے ٹکڑے رکھے تھے۔

وہ ساری رات سو نہیں سکا۔ اس کی جب آنکھ لگتی اسے ڈراونے خواب آنے لگتا سے لگتا جیسے تصویروں والے سارے لوگ اس کی بوٹیاں نوچ رہے ہوں، اس کا خون چوس رہے ہوں۔ تحقیر آمیز قہقہے لگا رہے ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ رمیش بھی ہوتا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ قریب کے بستر پر رمیش پر سکون سویا نظر آیا۔ وہ کمرے کا جائزہ لیتا۔ اس کی نظر ہر بار ان اینٹوں پر جا کر جم جاتی ۔ یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔ صبح اس پر سخت نیند کا غلبہ ہوا مگر وہ سو نہیں سکا وہ بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ ان اینٹوں تک گیا۔ ایک اینٹ ہاتھ میں لے کر رمیش کے بستر تک آ گیا اسے ایک ٹک دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ محبت اور نفرت کا ملا جلا تاثر اس کے چہرے سے عیاں تھا لیکن نفرت نے اسے طاقت بخشی اور وہ پوری طاقت سے رمیش کے سر پر وہ اینٹ مار دی۔

ایک دعا کی موت

نہ زمین تانبے کی ہوئی تھی، نہ سورج ہی سوا نیزے پر اترا تھا اور نہ پہاڑ ہی روئی کے گالوں کی طرح فضاؤں میں اڑ رہے تھے، لیکن ۷ ارستمبر کی وہ بھیانک رات قیامت سے کسی صورت بھی کم نہ تھی۔ بندوق، ٹینک اور توپ ہر سمت سے آگ اگل رہے تھے۔ فاسفورس بم جسموں کو جھلسا رہے تھے اور بادسموم بھی آنکھیں بند کر کے گولیاں کھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ ہر طرف بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور بے سروسامان جوانوں کی چیخ صور اسرافیل کی طرح روح کو لرزا رہی تھی مگر حاملہ فاطمہ عمادی جوزچگی کے دنوں کے بہت قریب تھی۔ اپنے جواں سال شوہر کی لاش کو آنسوؤں سے عاری آنکھوں سے دم سادھے ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہی تھی اور سوچ رہی تھی کاش! وہ بیٹا ہی جنے جو اپنے باپ اور مظلوم ومحکوم فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کا بھرپور انتقام لے۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کے ابھرے ہوئے پیٹ پر چلا گیا۔ اس نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا اس وقت اس کا پیٹ غیر معمولی طور پر اسے بڑا محسوس ہوا۔ جس سے اس کی ویران اور اداس آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی اور وہ اسی وقت خالق کائنات کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی اور رو رو کر دعا کرنے لگی۔

اے رب العالمین، اے خالق کائنات تو سمیع الدعا بھی ہے، قادر مطلق بھی ہے، مجھ مظلوم کی اپنے رحمتوں کے طفیل ایک معمولی سی دعاء قبول کرلے......!

میں خنزیروں اور کتیوں کے طرح کئی بچے ایک ساتھ جنوں، ان میں نصف بیٹے ہوں اور نصف بیٹیاں۔ بیٹوں میں ایک ہٹلر ہو اور بیٹیاں بڑی ہو کر وہ بھی خنزیروں اور کتیوں کی طرح کئی کئی بچے ایک ساتھ جنیں۔ ان کے بیٹوں میں بھی ایک ہٹلر ہو ان کی بیٹیاں بھی خنزیروں اور کتیوں کی طرح بچے جنیں ان میں بھی ایک ہٹلر ہو...... ان میں بھی ایک ہٹلر ہو ...... ہٹلر ہو۔

اس کی آواز رفتہ رفتہ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ ہٹلر...... ہٹلر......!

''ٹھائیں ...... آواز کی تعاقب میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اسرائیلی میجر حداد کے کئی کتے کیمپ کی طرف لپک پڑے۔

فاطمہ دم سادھے مردوں کے انبار میں پیٹ کے بل گر کر گم ہو گئی۔ خونخوار بھیڑیوں نے ایک گہری نظر ہر سمت سرعت سے ڈالی اور پھر ان کے چہرے کو اپنے بوٹوں سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور دیکھتے ہوئے نکل گئے۔

فاطمہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ہر حالت میں اپنی زندگی آنے والے بچے کے لئے بچانا چاہ رہی تھی اس لئے وہ بالکل ٹرینڈ فوجی انداز میں رینگتے ہوئے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

رات ڈھل چکی تھی۔ چاند اُداس منہ لٹکائے مغرب کی طرف جھکا تھا۔ ستارے مغموم آنکھوں سے بے بس مظلوم فاطمہ کو دیکھ رہے تھے اور وہ ان سب سے بے نیاز دمشق جانے والی شاہراہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے کیمپ سے دور ہوتی گئی اس کی رفتار بڑھتی گئی۔ اور وہ جب کافی دور نکل گئی تو وہ اپنی پوری ہمت و طاقت یکجا کر کے بے تحاشہ دوڑنے لگی۔

دھائیں، دھائیں ...... مشین گنوں کی گولیوں کے ایک قافلہ نے اس کا پیچھا کیا مگر وہ کمال ہوشیاری سے زمین پر دراز ہو گئی اور رینگتے ہوئے ایک ببول کی جھاڑی میں چھپ گئی۔

فضا سائیں سائیں کرنے لگی۔ سانسیں رک رک کر بے ترتیب ہو کر چلنے لگی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دل کی دھڑکنیں فوجی بوٹوں کی آواز کی آمد کے ساتھ بڑھتی ہی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی خونخوار درندے سروں پر سوار ہو گئے۔

"لله لا تقتلنی" اللہ کے واسطے مجھے مت مارو۔ فاطمہ گڑگڑائی۔

"لماذا" (کیوں؟) اور بندوق میں لگے نشتر کا پھل اس کے ابھرے پیٹ پر رکھ دیا۔

لانی اکون والدة اول مرة (اس لئے کہ میں پہلی دفعہ ماں بننے والی ہوں) فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے نشتر کو پکڑ لیا کیوں نہ وہ کچھ دباؤ محسوس کرنے لگی تھی۔

افاذن یلدعدوتی (تو کیا میں اپنے دشمن کو پیدا ہونے دوں) اور ایک فلک شگاف قہقہہ کے ساتھ پورا نشتر اس کے پیٹ میں اتار دیا۔

خون کا ایک فوارہ بل پڑا اور سرخ سرخ خون میں ڈوبا ہوا سورج امن وانسانیت کے علمبرداروں کا منہ چڑ تا ہوا نصف النہار تک پہنچ گیا۔

تلاش

عارف ایک شہرت یافتہ افسانہ نگار تھا اس کی تخلیقات ملک کے تمام ادبی اور نیم ادبی جریدوں میں نمایاں طور پر چھپتیں اور ان کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک کے گوشے گوشے سے تعریفی وتنقیدی خطوط آتے جنہیں دیکھ کر وہ فطری طور پر بہت خوش ہوتا اور خوشی خوشی ان خطوں کے ڈھیر سے ریحانہ کا خط تلاش کرتا اور نہ پا کر بہت اداس ہو جاتا۔ اس کی کوشش رائیگاں محسوس ہوتی مگر وہ نا امید نہیں ہوتا اور ایک نئے عزم کے ساتھ ایک نئے افسانہ کے تخلیق میں لگ جاتا۔

اسے کبھی افسانہ نگاری سے شوق نہیں رہا تھا مگر ریحانہ کی محبت میں طویل طویل خط لکھتے لکھتے اس فن سے آشنا ہو گیا تھا۔ آج اس فن کے ذریعہ اپنی بات ریحانہ تک پہنچانا چاہتا تھا جسے وہ روبرو کہہ نہ سکا تھا۔ وہ اپنے افسانے کا ہیرو خود ہوتا تھا اور ہیروئن کی کردار میں ریحانہ ہی متحرک ہوتی۔ وہ اپنے ہر افسانہ میں اپنی ہی محبت کا کوئی نہ کوئی عکس پیش کرتا اور اس نے اپنی شاہکار تصنیف ''تلاش'' میں بھی وہی سب کچھ پیش کیا تھا بلکہ اپنی محبت کو شروع سے آخر تک دنیا والوں پر آشکار کر دیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا دنیا والے بھی عجیب ہیں۔ ان دنیا والوں کو عارف اور ریحانہ کی محبت ایک آنکھ نہ بھائی تھی اور آج جب اسے عارف نے رضا اور شبانہ کے روپ میں دنیا والوں

کے سامنے پیش کیا تو دنیا والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکیڈمیوں نے سراہتے ہوئے اعزاز سے نوازا۔ مگر اسے یہ سب کچھ فضول لگ رہا تھا کیونکہ اس نے اب تک جو کچھ بھی لکھا تھا صرف اور صرف ریحانہ کے لئے مگر اب تک وہ اس کی تعریف وتنقید سے محروم تھا۔ ''تلاش'' کے اشاعت کے بعد ملک کے گوشے گوشے سے اسے خطوط ملے تھے۔ میں بھی ریحانہ کا کوئی خط نہ تھا۔

وہ بڑی بے دلی سے اپنے سامنے بکھرے خطوط کو ایک بار پھر دیکھنے لگا۔ اس بار اس کی نظر کلکتہ سے آئے ایک لفافہ پر ٹک گئی۔ اس نے دھڑکتے دل سے لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگا۔ وہ خط کلکتہ کے ایک مشہور ادبی ادارہ ''پاسبان ادب'' کی طرف سے تھا۔ تلاش کے سلسلہ میں اسے مبارک باد دی گئی تھی اور اس کے اعزاز میں ایک ادبی شام اس کے نام سے منانے کے لئے اسے مدعو کیا گیا تھا۔

''کلکتہ!'' اس کی زبان سے اس طرح نکلا جیسے کوئی عاشق اپنے گم گشتہ معشوق کا نام لیتا ہے اور اس کے سامنے کلکتہ میں گزرے ریحانہ کے ساتھ تمام واقعات منظر بہ منظر ایک کے بعد دیگرے ابھرنے لگے۔

عارف حسب معمول صبح اخبار بانٹتا ہوا مشہور وکیل حامد کھنڈیلوال کے گھر گیا اور اخبار دروازہ کے نیچے سے سرکانا ہی چاہا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ایک پرشباب دوشیزہ آنکھوں میں خواب لئے روبرو کھڑی ہوگئی۔ عارف تھوڑی دیر کے لئے ساکت رہ گیا۔

''گڈ مارننگ'' عارف کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

''مارننگ'' اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور جب عارف جانے کے لئے مڑا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر اردو کا ایک بہت پرانا اخبار آزاد ہند ہی روز دینے کو کہا۔ اور اس سے دریافت کیا ''آپ کلکتہ یونیورسٹی میں کل کیا کر رہے تھے؟''

''M.A میں داخلہ لیا ہے۔'' عارف بے جھجک کہہ گیا۔ ''میں ......!'' اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

یونیورسٹی میں جب عارف سے ملاقات ہوئی تو وہ اس کے قریب آکر بولی۔

''آپ کی بات پر سویرے مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ آپ اخبار کیوں بانٹتے ہیں، ٹیوشن بھی پڑھا سکتے ہیں۔''

''ہاں ! پڑھا سکتا ہوں ٹیوشن ۔ لیکن اخبار بانٹنا اچھا لگتا ہے ۔ اس طرح بہت سارے لوگوں سے جان پہچان ہو جاتی اور زندگی کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ اخبار بانٹنا اکسر سائز کا بہترین ذریعہ ہے۔ دیکھئے میری صحت !''

اور اپنا تعارف کرا دیا۔ ''میرا نام عارف نجمی ہے۔''

''میں ریحانہ۔ ہنستے ہوئے بولی۔

یہ مختصر تعارف ہی محبت کی تمہید بن گئی اور دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہو گئے مگر سماج نے اپنا وہی پرانا ویلن والا رول ادا کیا۔

عارف دھڑ کتے دل سے اپنے بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود دعوت نامہ قبول کر کے مقررہ تاریخ کو کلکتہ پہنچ گیا۔ ادبی محفلوں میں شاعروں، ادیبوں اور ادب نوازوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی ادبی خدمات کو جی کھول کر تفصیل سے سراہا گیا۔ سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ صحافیوں نے خوب خوب مضامین لکھے اور تصویر شائع کیں۔ عارف نہال ہو گیا ۔ وہ کلکتہ اور کلکتہ والوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہندستان کے کسی بھی حصے سے کوئی بھی ادیب یا شاعر کلکتہ آجائے تو اس کی پذیرائی ہوتی ہے۔ ادبی نشستیں منعقد ہوتی ہیں مگر کلکتہ کے شاعر یا ادیبوں کے ساتھ باہر ایسا کیوں نہیں ۔رتا۔ علامہ جمیل مظہری اور وحشت کلکتوی کے علاوہ کوئی اور کیوں نہیں ملک گیر شہرت حاصل کر سکا۔ شاید اس کی وجہ کلکتہ کے اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر ہیں۔ جو ان کی خدمات کو نہ سراہ کر دوسرے اسٹیٹ کے ادیبوں کو سراہتے ہیں...... وہ سوچتے سوچتے کسی اخبار کو دیکھنے لگا۔

آج وہ اپنے تمام ادبی مصروفیتوں سے فارغ ہو چکا تھا مگر مزید ایک روز رک کر ان تمام جگہوں پر جانے کا ارادہ کیا جہاں جہاں وہ پہلے ریحانہ کے ساتھ گیا تھا۔

عارف سب سے پہلے پارک اسٹریٹ گیا جہاں ایک بلڈنگ میں ریحانہ کا فلیٹ تھا مگر وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور نظر آیا۔ رادھا کو بسنر کے جگہ اب ایک ملٹی اسٹوریز بلڈنگ تھی وہ بہت نا امید ہو کر ایک انجانی امید کے تحت گراؤنڈ فلور میں گیا اور تمام لیٹر بکسوں کے نام پڑھے اور پھر رینگتا ہوا نکل آیا۔

وہ رابندر سروبر گیا جہاں وہ گھنے پیڑوں کی جڑ میں بیٹھ کر نہ جانے کیا کیا اور کیسی کیسی باتیں کی تھی لیکن جھیل کی سطح پر ابھرتی مٹتی لہروں پر ماضی کا کوئی واضح تصویر نہ دیکھ سکا۔ وہ دن

پھر یونہی ادھر اُدھر بھٹکتا رہا اور جب شام کا سرمئی آنچل پھیل رہا تھا اس کے قدم خود بخود دریا کنارے بڑھنے لگے۔ وہاں بے شمار جوڑوں کو دیکھ کر اسے ریحانہ خوب یاد آ رہی تھی۔

وہ Gay ہوٹل کے ایک ٹیبل پر چائے کی چسکی لے رہا تھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو ریحانہ!''

''اس جہاز کو دیکھ رہی ہوں'' ریحانہ کی آنکھیں دریا کے پانی کی طرح چمک رہی تھیں۔

''مجھے پانی جہاز پر سوار ہونے کی بڑی خواہش ہے۔''

''تو کسی کیپٹن سے شادی کرلو۔'' عارف نے شرارتی مسکراہٹ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''دھت!'' ریحانہ شرما سی گئی اور پھر اپنے ہاتھ میں عارف کا ہاتھ لے کر بولی۔ ''تم ہی کیپٹن بن جاؤ نا۔''

''میں تو ملٹن بنوں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں......وہ سنجیدہ ہوگئی۔'' ملٹن تو اندھا تھا۔''

''تو بشیر بدر بن جاؤں!'' عارف نے ایسے کہا جیسے بشیر بدر بننا بہت آسان ہو۔

''وہ اچھا نہیں ہے۔'' وہ رکی اور توقف سے کہا۔ ''مگر اس کے اشعار اچھے ہیں!

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ریحانہ نے شعر پڑھا۔ عارف نے یادوں کے اجالے میں ماضی کو دریائے ہگلی کے سینہ پر دیکھا جہاں تمام ٹھہری ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور ان میں جلتے مدھم لالٹین۔ اسے خوبصورت لگے۔

''ریحانہ میں تمہیں اس وقت جہاز پر تو نہیں سوار کر سکتا۔'' اور عارف ایک کشتی کی طرف بڑھنے لگا۔ '' مگر آج تمہیں کشتی سے دریا کی سیر کراؤں گا۔

کشتی دریائے ہگلی کے سینے پر ایک خاص دوری پر جا کر رک گئی۔ ملاح ایک کنارے پر ہلکے ہلکے سروں کچھ گنگنانے لگا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوائیں دل کو بے قابو کر رہی تھیں۔ عارف بے خود ہو کر تختہ پر لیٹ گیا اور ریحانہ کو تاکنے لگا۔ ریحانہ کے

ہونٹوں پر لہروں کی طرح مسکراہٹیں بار بار دونوں کناروں تک پھیل رہی تھی۔

اچانک ایک اسٹیمر بھدی سیٹی کے ساتھ قریب سے گزر گیا جس سے کشتی جیسے زلزلہ کی زد میں آگئی۔ ریحانہ خوف زدہ ہو کر عارف سے لپٹ گئی۔ اور پھر دونوں جذبات کے سمندر میں ڈوب کر ہی ابھرے۔

دونوں خموش خموش ریڈ روڈ پر چل رہے تھے۔

آئی لو یو سوچ ریحانہ۔

ریحانہ نے اس کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے اور پھر وہ اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔

''کچھ نہیں ہوگا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' عارف اس کے پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

دونوں کے تعلقات زیادہ دنوں تک چھپے نہیں رہے وکیل صاحب کو جیسے ہی معلوم ہوا۔ ریحانہ کو شادی کے لئے دوسرے شہر بھیج دیا گیا۔

وہ ہوٹل چھوڑنے ہی والا تھا کہ بیرا نے کسی کی آمد کی خبر دی اور ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت داخل ہوئی۔

''عرنی!'' ہوٹل کے چھوٹے سے کمرہ میں پیارا سا ایک نام گونج گیا۔ عارف گنگ ہو کر دیکھتا رہ گیا اور ایسی خاموشی چھائی جو اپنے آپ میں زبان و بیان کا طوفان تھی۔ ''کیسے ہو عارف! ریحانہ نے خاموشی توڑ دی۔

''تم کیسی ہو، ریحانہ؟'' فرط جذبات سے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''ایک بار تمہیں دیکھنے کی خواہش میں زندگی کا بوجھ ڈھوتا پھر رہا ہوں۔

''میری بھی حالت تم سے جدا نہیں عرنی!'' ریحانہ گلوگیر ہو کر کہنے لگی۔ ''میں بیوفا نہیں عرنی ...... میں نے تمہارے تمام افسانے پڑھے ہیں۔ تم نے اپنے افسانے کی ہیروئن کو کسی نہ کسی طرح بیوفا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تم نے مجھے دوسری راہ سے بیوفا کہا ہے ......عرنی! عورت بیوفا نہیں ہوتی، عورت مجبور ہوتی ہے اور اسے تم تنگ نظر مردوں نے ہی اس کے پیروں میں نام نہاد مشرقی تہذیب کی زنجیر دی ہے اور سچائی کی راہوں سے روکا ہے۔ ورنہ میں کب کی بھاگ کر تمہارے پاس آجاتی۔ تہذیب کا بے سرا راگ الاپ کر عورتوں کو جھوٹ بولنے پر مجبور کیا ہے ورنہ میں بھی تمہارے پیار کا اعتراف سماج میں کرتی۔ مگر ایسا نہ

کرسکی اور تمہارے پیار کو دل سے لگائے اپنے شوہر سے جھوٹ بولتی رہی۔ باوفا ہونے کی ڈھونگ رچاتی رہی ہاں میں بیوفا ہوں، بیوفا۔''

''بس کرو ریحانہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ گلہ شکوہ سے کوئی فائدہ نہیں۔'' عارف سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''قسمت سے کچھ دیر کا تمہارا ساتھ ملا ہے۔ کچھ ایسی باتیں کرو جن کی یاد سے زندگی کے باقی دن کٹنے میں تکلیف نہ ہو۔''

''عرفی!'' اور ریحانہ اس کی باتوں سے پھوٹ کر رو پڑی۔

''تمہارے ہاتھ میں یہ نشان کیسے ہیں؟'' عارف اس کے داہنے ہاتھ میں جلنے کا نشان سے متعلق دریافت کیا۔

''تم مجھے یاد دلانا چاہتے ہو، عرفی۔'' وہ آنسو پوچھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے پیار میں گزرا ہر لمحہ اور ہر لمحہ میں پیش آنے والا ہر حادثہ ہو بہو نگاہوں میں ہے۔ اس نشان کے بارے میں تم جانتے ہو۔ تمہاری یاد میں گم ہو کر ایک روز میں نے اپنا ہاتھ بھول سے کڑھائی میں ڈال دیا تھا...... اور پھر تم نے اس ہاتھ کو جو بدصورت ہو گیا ہے کتنا پیار کیا تھا میں آج بھی اس بدصورت ہاتھ کو تمہاری نظر سے دیکھتی ہوں۔ بہت خوبصورت لگتا ہے۔

عارف نے اس ہاتھ پر کئی بوسے دیئے۔

''تم تو بوڑھے ہو رہے ہو'' ریحانہ عارف کے سر کے پکے بالوں میں انگلیا پھیرتے ہوئے بولی۔ ''کتنے بچے ہیں تمہارے؟''

''بچے......؟ عارف زیر لب بڑبڑایا اور سنجیدگی سے کہا۔''میں نے شادی نہیں کی۔''

کیوں......؟ ریحانہ ایک دم چونک گئی۔

کیسے کرتا۔ ریحانہ!'' عارف لاچار اور بے بس لہجے میں کہنے لگا۔'' پیار تم سے کروں اور شادی کسی اور سے۔ نہیں ریحانہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکا۔ میں خود کو ظلم اور نا انصافی کے مقام پر نہ لا سکا تم نے تو جھوٹ بول بول کر اپنا گھر بسا لیا۔ اپنے شوہر کا پیار پالیا میں دوہری ایکٹنگ نہ کر سکا۔ کسی عورت سے جھوٹ بول کر رنج پہچاننے کی جرأت نہ کر سکا۔''

''عورت تو دکھ اٹھانے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے عرفی''۔ ریحانہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ''اگر تم اس عورت سے کہہ بھی دیتے کہ تم کسی اور عورت کو بھی پیار کرتے ہو تو وہ شاید معمولی احتجاج بھی نہ کرتی، عورت تمہارے سماج میں اپنی اوقات خوب پہچانتی ہے۔''

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟'' عارف اس کی سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے کہا۔
''ایک ...... اور دو۔'' ریحانہ اطمینان سے بولی۔ ''کیا مطلب؟'' عارف حیران ہوگیا۔
ایک لڑکی اور دو لڑکے۔'' ریحانہ کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آگئی۔
''ریحانہ! اگر میری شادی تم سے ہوگئی ہوتی تو یہ تینوں بچے میرے ہوتے۔'' وہ بچوں کی طرح بچکانہ انداز میں کہہ گیا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا۔ ''میں اولاد کی نعمت سے محروم رہ گیا۔ اپنا کوئی وارث دنیا میں نہیں چھوڑ سکا۔
''نہیں عرفی ...... تم میرے تینوں بچوں کے مشترکہ باپ تو نہیں ہو مگر ......'' ریحانہ کہتے کہتے رکی اور بولی ''میری بیٹی عالیہ کے اکلوتے باپ ہو۔'' ہماری محبت کی نشانی عالیہ ہی تو ہے۔''
''ریحانہ!!! عارف زور سے چیخ اٹھا اور پھر پاگلوں کی طرح بولنے لگا۔ ''تمہاری بیٹی عالیہ کا باپ میں ہوں۔ میں بے اولاد نہیں ہوں ...... عالیہ!'' وہ پھر زور سے چیخا۔
''عرفی! عرفی!!'' ریحانہ نے عارف کو جھنجھوڑ دیا۔
''مجھے سب کچھ مل گیا، ریحانہ۔'' وہ دیوانہ وار بول رہا تھا۔ میری تلاش مکمل ہوگئی۔''

ایک دعا کی موت
فاروق انصار